تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا

قرآن حکیم کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح طور پر نکھر کر سامنے آتی ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کی حقیقی اساس طبعی قوانین نہیں بلکہ غیر طبعی یا اخلاقی ضابطے ہیں' اور خداوند قدوس انہی کے مطابق اقوام و ملل کی قسمت کے فیصلے فرماتا ہے۔ اس حقیقت کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملت اسلامیہ کی ہمہ جہت ذلت وپستی کا اصل سبب مادی وسائل کی کمی کے بجائے اس ضابطہ زندگی سے اعراض ہے جو خدا تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لیے نازل کیا ہے۔ یہی وہ جرم عظیم ہے جس پر مسلسل اصرار کی بنا پر آج مسلم قوم راندۂ درگاہ قرار دے دی گئی ہے اور اس پر ادبار ونکبت کا عذاب مسلط کر دیا گیا ہے۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ نام نہاد لیڈرانِ قوم اور برخود غلط زعمائے ملت اس واضح اور کھلی حقیقت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے حل مسائل کے لیے اپنے اپنے راگ الاپ رہے ہیں۔ کسی کے نزدیک اقتصاد ومعیشت کی ترقی مسئلے کا حل ہے تو کوئی جمہوریت کے استحکام کو کامیابی کا ضامن بتاتا ہے اور کسی کی نظر میں سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں ہماری پسماندگی ہی تمام مصائب ومشکلات کی جڑ ہے کہ اگر اس شعبے میں بہتری آجائے تو ہم شاہراہِ کامرانی پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر خدا کا قانون بتاتا ہے کہ جو معاشرہ پیغمبروں کی بتائی ہوئی راہِ ہدایت سے منہ موڑ لیتا ہے' بربادی ورسوائی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے اور اس کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ اگر کوئی قوم اپنی غلطی کا احساس کر لے اور معصیت و نافرمانی کی روش ترک کر کے ربّ ذوالجلال کے عطا کردہ نظامِ حیات کو اپنا لے تو اس کی قسمت بدل جاتی ہے' اس کی مہلتِ عمل میں اضافہ ہو جاتا ہے اور مستقبل میں ناکامی ونامرادی کے بجائے کامیابی وکامرانی اس کے قدم چومتی ہے۔

سچ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ سے آج یہی رویہ مطلوب ہے جسے 'توبہ' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انفرادی و اجتماعی ہر دو سطح پر سچی توبہ ہی ہمارے نجی اور ملی مسائل کا واحد حل ہے۔ اس کے سوا ہر صورت ہلاکت و بربادی پر منتج ہوتی ہے۔ توبہ سے مراد صرف یہ نہیں کہ زبان سے استغفر اللہ کا ورد کر لیا جائے اور اپنے طرزِ زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی جائے' بلکہ حقیقی توبہ یہ ہے کہ ہم تمام باطل نظاموں اور طاغوتی

ضابطوں کو چھوڑ کر شریعت الٰہی کی طرف پلٹ آئیں۔ قرآن وسنت کے مطابق ذاتی وانفرادی اصلاح سے لے کر قومی وملی سطحوں تک اپنے کردار وعمل کو سدھاریں اور خدا کی شریعت کو تمام شعبہ ہائے زندگی میں نافذ کردیں۔ گویا غیر اللہ کو ٹھوکر مار کر خدا کی طرف پلٹ آئیں کہ رجوع الی اللہ ہی توبہ کی اصل حقیقت ہے اور یہی فلاح وکامیابی واحد راستہ ہے۔ اس ابدی ودائمی ضابطے کو قرآن نے واشگاف انداز میں یوں بیان کیا ہے:

﴿وَتُوبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (النُّور)

''اے مسلمانو! تم سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم نجات پاؤ۔''

سالِ نو کا پہلا شمارہ 'حکمت قرآن' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ پچھلے برس سے یہ نئی آب وتاب سے شائع ہو رہا ہے۔ ادارہ اسے بہتر سے بہتر انداز میں پیش کرنے کی مقدور بھر سعی کرتا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ رفقائے ادارہ کی کاوشوں اور دیگر اربابِ علم وفکر کی معاونت سے مجلّہ کی ظاہری ومعنوی خوبصورتی میں اضافہ ہو رہا ہے' جیسا کہ قارئین کے تأثرات سے اندازہ ہوا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ میں بھی حسبِ سابق مقالہ نگاروں نے مختلف النوع موضوعات وعناوین پر قلم اٹھایا ہے۔ محتویات کا ایک سرسری جائزہ پیشِ خدمت ہے:

۞ قرآن کریم کلامِ الٰہی پر مشتمل وہ عظیم الشان معجزہ ہے جو محمد عربی ﷺ کی رسالت ونبوت کی روشن دلیل ہے۔ اعجازِ قرآن کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک نمایاں پہلو ''علم الوجوہ والنظائر' ہے جو علوم قرآن کی بیسیوں اقسام میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ''الوجوہ والنظائر'' کی رو سے مختلف مقاماتِ قرآنی پر وارد ہونے والے کلمات کے مختلف اور متنوع معانی ومفاہیم پر بحث کی جاتی ہے۔ قارئین حکمت قرآن کی جانی پہچانی شخصیت جناب حافظ محمد مشتاق ربانی نے اسی علم کی روشنی میں ''قرآن حکیم میں علم کے تفسیری معانی'' کے عنوان سے بے حد مفید اور علمی وتحقیقی مضمون سپردِ قلم کیا ہے اور 'علم' کے گیارہ معانی بیان کیے ہیں' جو یقیناً قارئین کے علم میں اضافے کا موجب ہوں گے۔

۞ سنت رسول ﷺ شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی ترین مصادر میں شامل ہے۔ علمائے سلف اور ائمہ اہل سنت نے حدیث وسنت کی آئینی وقانونی حیثیت نصوصِ شرعیہ کی روشنی میں وضاحت وصراحت سے متعین کردی ہے۔ سنت سے اخذ واستنباط کرتے ہوئے اسے سامنے کھنا ازبس ناگزیر ہے' بصورت دیگر نئی علمی وعملی لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں' جیسا کہ بعض لوگوں کے طرزِ فکر وعمل سے ''سنت'' کے سلسلہ میں عدم توازن کی جھلک نظر آتی ہے۔ جناب حافظ محمد زبیر نے اسی طرزِ عمل کی اصلاح کے لیے ''اہل سنت کا تصورِ سُنّت'' اُجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ سابقہ شماروں میں اسی عنوان سے ان کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

(باقی صفحہ 20 پر)

زیرِ نظر شمارے میں بعض نئے نکات اور تصریحات کے علاوہ ایک معروف فقہی دبستان یعنی حنفی مکتبِ فکر کے تصورِ سنت کو موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں نکھار کر پیش کیا ہے۔

۞ عصرِ حاضر کی بعض احیائی تحریکوں سے وابستہ کچھ جوشیلے نوجوانوں کے خیال میں مسلح جدوجہد ہی اسلامی انقلاب برپا کرنے کا واحد راستہ ہے۔ دعوت و تبلیغ اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر و مصابرت کا رویہ ان کے نزدیک ناقابلِ عمل ہے' کیونکہ ان کے مطابق یہ ''مکی دور'' سے متعلق تھا جو کہ اب منسوخ ہو چکا ہے۔ جناب اویس پاشا نے اپنے مضمون ''غلبہ اسلام کا طریقہ کار۔ ایک اشکال کا جائزہ'' میں اسی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ ادبیت کا رنگ لیے ہوئے یہ تحریر سنجیدہ اور علمی انداز میں لکھی گئی ہے۔

۞ مستقل سلسلوں میں جناب لطف الرحمٰن خان کا ''ترجمہ قرآن مجید مع صرفی و نحوی تشریح''، حکمتِ نبویؐ کے تحت جناب محمد یونس جنجوعہ صاحب کی تشریح حدیث اور تبصرۂ کتب بھی شمارے کا حصہ ہے۔ علاوہ ازیں محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کا انگریزی دورۂ ترجمۂ قرآن The Message of The Quran بھی شاملِ اشاعت ہے جو انگریزی دان طبقے کے لیے فہمِ قرآن کا ایک مفید ذریعہ ہے۔

باری تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور ہمیں ہر لمحہ اپنی مرضیات سے نوازتا رہے۔

آمین یا الٰہ العالمین!

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۂ آل عمران (مسلسل)

آیات ۹۸، ۹۹

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ♦ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ♦ ﴾

ع و ج

عَوِجَ (س) عَوْجًا: کسی چیز کا ٹیڑھا ہونا۔

عِوَجٌ (اسم ذات): کجی، پیچیدگی، آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''تَصُدُّوْنَ'' کا مفعول ''مَنْ اٰمَنَ'' ہے۔ ''تَبْغُوْنَهَا'' کی ضمیر مفعولی ''سَبِيْل'' کے لیے ہے۔ ''سَبِيْلٌ'' مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے اس لیے مؤنث ضمیر بھی درست ہے۔ ''عِوَجًا'' مفعول ثانی ہے۔

ترجمہ:

قُلْ: آپؐ کہیے	يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ: اے اہل کتاب
لِمَ تَكْفُرُوْنَ: تم لوگ کیوں انکار کرتے ہو	بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: اللہ کی آیات کا
وَ: حالانکہ	اللّٰهُ: اللہ

شَهِيْدٌ : گواہ ہے
تَعْمَلُوْنَ :تم لوگ کرتے ہو
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ :اے اہل کتاب
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ :اللہ کے راستے سے
اٰمَنَ :ایمان لایا
عِوَجًا : پیچیدگی کو
اَنْتُمْ :تم لوگ
وَمَا اللّٰهُ :اوراللہ نہیں ہے
عَمَّا :اس سے جو

عَلٰى مَا :اس پر جو
قُلْ : آپ ؐ کہیے
لِمَ تَصُدُّوْنَ :تم لوگ کیوں روکتے ہو
مَنْ :اس کو جو
تَبْغُوْنَهَا:تم لوگ تلاش کرتے ہو اس میں
وَّ : حالانکہ
شُهَدَآءُ : گواہ ہو
بِغَافِلٍ :غافل
تَعْمَلُوْنَ :تم لوگ کرتے ہو

آیات ۱۰۰،۱۰۱

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ❖ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ❖﴾

ع ص م

عَصَمَ (ض) عَصْمًا :کسی کو کسی سے بچانا۔﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدۃ:٦٧) ''اوراللہ بچائے گا آپ ؐ کو لوگوں سے۔''

عَاصِمٌ (اسم الفاعل) :بچانے والا۔﴿مَالَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ﴾ (یونس:٣٢) ''ان کے لیے نہیں ہے اللہ سے کوئی بچانے والا۔''

عِصَمٌ (اسم ذات) :بچاؤ' حفاظت۔اس مفہوم کے ساتھ نکاح کے لیے آتا ہے:﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾(الممتحنۃ:١٠) ''اورتم لوگ مت تھامو یعنی مت قائم رکھو کافر عورتوں کے نکاح کو۔''

اِعْتَصَمَ (افتعال) اِعْتِصَامًا: بچاؤ یا حفاظت کے لیے کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنا۔آیت زیر مطالعہ۔

اِعْتَصِمْ: تو مضبوطی سے پکڑ۔﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾(آل عمران:١٠٣) ''اورتم لوگ مضبوطی سے پکڑو اللہ کی رسی کو' سب کے سب۔''

اِسْتَعْصَمَ (استفعال) اِسْتِعْصَامًا : بچاؤ یا حفاظت چاہنا یعنی باز رہنا۔﴿وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ﴾ (یوسف:٣٢) ''میں نے پھسلایا اس کو اس کے نفس سے تو وہ باز رہا۔''

ترجمہ:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ: اے لوگو جو	اٰمَنُوْٓا: ایمان لائے
اِنْ تُطِیْعُوْا: اگر تم لوگ اطاعت کرو گے	فَرِیْقًا: کسی فریق کی
مِّنَ الَّذِیْنَ: ان میں سے جو	اُوْتُوْا: دیے گئے
الْکِتٰبَ: کتاب	یَرُدُّوْکُمْ: تو وہ لوگ پھیر دیں گے تم کو
بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ: تمہارے ایمان کے بعد	کٰفِرِیْنَ: کفر کرنے والا ہوتے ہوئے
وَکَیْفَ تَکْفُرُوْنَ: اور تم لوگ کیسے کفر کرو گے	وَ: حالانکہ (یعنی جبکہ)
اَنْتُمْ: تم لوگ ہو (کہ)	تُتْلٰی عَلَیْکُمْ: پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تم کو
اٰیٰتُ اللّٰہِ: اللہ کی آیتیں	وَ: اور (جبکہ)
فِیْکُمْ: تم لوگوں میں ہے	رَسُوْلُہٗ: اس کا رسولؐ
وَمَنْ یَّعْتَصِمْ: اور جو مضبوطی سے پکڑے گا	بِاللّٰہِ: اللہ کو
فَقَدْ ھُدِیَ: تو لازماً اس کی راہنمائی کی جائے گی	اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ: ایک سیدھے راستے کی طرف

آیات ۱۰۲، ۱۰۳

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۟ وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ
اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖۤ اِخْوَانًا۟ وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ
النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا۟ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ۝﴾

ح ب ل

حَبَلَ (ن) حَبْلاً: رسّی سے باندھنا۔

حَبْلٌ ج حِبَالٌ (اسم ذات): رسّی، معاہدہ۔ ﴿فَاَلْقَوْا حِبَالَھُمْ وَعِصِیَّھُمْ﴾ (الشعراء:٤٤) ”تو انہوں نے ڈالیں اپنی رسّیاں اور اپنی لاٹھیاں۔“

ش ف و

شَفَا (ن) شَفْوًا: چاند نکلنا، کسی چیز کا کنارہ ظاہر ہونا۔

شَفَا :ہر چیز کا کنارا۔آیت زیر مطالعہ۔

ح ف ر

حَفَرَ (ض) حَفْرًا :مٹی کھودنا' گڑھا بنانا۔

حَافِرَةٌ(اسم الفاعل) :مٹی کھودنے والا' پھر استعارۃً گھوڑے کے سُم اور دوسرے قدموں کے لیے آتا ہے جو چلتے وقت مٹی اُڑاتے ہیں۔﴿ءَ اِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ۝﴾ (النّٰزعٰت) ''کیا ہم لوگ ضرور لوٹائے جانے والے ہیں قدم میں یعنی اُلٹے پاؤں۔''

حُفْرَةٌ (اسم ذات) :گڑھا۔آیت زیر مطالعہ۔

ن ق ذ

نَقَذَ (ن) نَقْذًا :نجات دینا' چھوڑنا۔

اَنْقَذَ (افعال) اِنْقَاذًا :کسی آنے والی مصیبت سے بچانا۔آیت زیر مطالعہ۔

اِسْتَنْقَذَ (استفعال) اِسْتِنْقَاذًا :کسی مصیبت میں گرفتار کو چھڑانا' نجات دلانا۔﴿وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ﴾ (الحج:۷۳) ''اور اگر چھین لے ان سے مکھی کوئی چیز تو وہ لوگ نہ چھڑا سکیں اس کو اس سے۔''

ترکیب:''جَمِیْعًا'' تمیز ہے۔''تَفَرَّقُوْا'' کی ایک ''تا'' گری ہوئی ہے' یعنی یہ فعل نہی ''لَا تَتَفَرَّقُوْا'' ہے۔''کُنْتُمْ'' کی خبر ''اَعْدَاءً'' ہے۔''اَصْبَحْتُمْ'' فعل ناقص ہے۔اس کا اسم ''اَنْتُمْ'' کی ضمیر ہے اور ''اِخْوَانًا'' اس کی خبر ہے۔''وَکُنْتُمْ'' کی خبر محذوف ہے جو ''قَائِمِیْنَ'' ہو سکتی ہے۔''عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ'' قائم مقام خبر ہے۔''فَاَنْقَذَ'' کا فاعل اس میں ''هُوَ'' کی ضمیر ہے جو اللہ کے لیے ہے۔ ''یُبَیِّنُ' کا مفعول ہونے کی وجہ سے ''اٰیٰتِهٖ'' منصوب ہے۔

ترجمہ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو
اٰمَنُوا	:ایمان لائے
اتَّقُوا	:تم لوگ تقویٰ کرو
اللّٰهَ	:اللہ کا
حَقَّ تُقٰتِهٖ	:(جیسا کہ) اس کے تقویٰ کا حق ہے
وَلَا تَمُوْتُنَّ	:اور تم لوگ ہرگز مت مرنا
اِلَّا	:مگر
وَ	:اس حال میں کہ
اَنْتُمْ	:تم لوگ
مُّسْلِمُوْنَ	:فرماں برداری کرنے والے ہو
وَاعْتَصِمُوْا	:اور تم لوگ مضبوطی سے پکڑو
بِحَبْلِ اللّٰهِ	:اللہ کی رسّی کو
جَمِیْعًا	:سب کے سب
وَّلَا تَفَرَّقُوْا	:اور تم لوگ پھٹ کر الگ الگ مت ہو

وَاذْكُرُوْا :اور یاد کرو	نِعْمَتَ اللّٰهِ :اللہ کی نعمت کو
عَلَيْكُمْ :اپنے اوپر	اِذْ كُنْتُمْ :جب تم لوگ
اَعْدَآءً :دشمن تھے	فَاَلَّفَ :پھر اس نے محبت پیدا کی
بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ :تمہارے دلوں کے درمیان	فَاَصْبَحْتُمْ :تو تم لوگ ہو گئے
بِنِعْمَتِهٖ :اس کی نعمت سے	اِخْوَانًا :بھائی بھائی
وَكُنْتُمْ :اور تم لوگ تھے	عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ :ایک گڑھے کے کنارے پر
مِّنَ النَّارِ :آگ میں سے	فَاَنْقَذَكُمْ :پھر اس نے بچایا تم کو
مِّنْهَا :اس سے	كَذٰلِكَ اس طرح
يُبَيِّنُ: واضح کرتا ہے	اللّٰهُ :اللہ
لَكُمْ: تمہارے لیے	اٰيٰتِهٖ :اپنی آیتوں کو
لَعَلَّكُمْ: شاید کہ تم لوگ	تَهْتَدُوْنَ :ہدایت پاؤ

نوٹ: سمجھنے والی بات یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اختلاف سے منع نہیں کیا ہے بلکہ تفرقہ سے روکا ہے۔ اختلاف ایک فطری امر ہے' اس لیے یہ تو ہوگا اور رہے گا۔ اختلاف تو صحابہ کرامؓ میں بھی تھا۔ لیکن اس کی بنیاد پر پھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جانا اور ایک دوسرے کی تنقیص کرنا تفرقہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس حرکت سے منع کیا ہے۔

آیت زیر مطالعہ کی تفسیر میں مفتی محمد شفیعؒ نے کافی تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ ''اگر قرآن پر مجتمع رہتے ہوئے اور حضور اکرم ﷺ کی تشریح و تفصیل کو قبول کرتے ہوئے اپنی فطری استعداد اور دماغی صلاحیتوں کی بنا پر فروع میں (یعنی جزوی باتوں میں) اختلاف کیا جائے تو یہ اختلاف فطری ہے اور اسلام اس سے منع نہیں کرتا۔ صحابہؓ و تابعین اور ائمہ فقہاء کا اختلاف اسی قسم کا اختلاف تھا اور اسی اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا ہے۔ ہاں اگر ان ہی فروعی بحثوں کو اصل دین قرار دیا جائے اور ان میں اختلاف کو جنگ و جدل اور سبّ و شتم کا ذریعہ بنا لیا جائے تو یہ بھی مذموم ہے''۔ (معارف القرآن)

آیات ۱۰۴'۱۰۵

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

ن ک ر

نَـكِرَ (س) نَـكَرًا : (۱) کسی چیز کا عرفان نہ ہونا' کسی کو اجنبی سمجھنا۔ (۲) نا گوار ہونا' برا ہونا (اجنبیت انسان کو اچھی نہیں لگتی)۔ ﴿نَـكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً﴾ (ھود: ۷۰) ''انہوں نے اجنبی سمجھا ان کو اور محسوس کیا ان سے خوف۔''

نَـكِيْرٌ : فَعِيْلٌ کا وزن ہے۔ اسم ذات کے معنی میں آتا ہے۔ ناواقفیت' عدمِ عرفان۔ ﴿فَكَيْفَ كَانَ نَـكِيْرِ ۰﴾ (سبا) ''تو کیسی تھی مجھ سے ناواقفیت!'' ﴿مَالَـكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَالَـكُمْ مِّنْ نَّـكِيْرٍ﴾ (الشوریٰ) ''تمہارے لیے نہیں ہوگی کسی قسم کی کوئی پناہ گاہ اس دن اور تمہارے لیے نہیں ہو گا کسی قسم کا کوئی عدمِ عرفان۔''

نُكُرٌ اور نُـكْرٌ (صفت): نا گوار' برا۔ ﴿فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا﴾ (الکھف) ''تو وہ عذاب دے گا اس کو ایک برا عذاب۔'' ﴿يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّـكُرٍ﴾ (القمر) ''جس دن بلائے گا بلانے والا ایک نا گوار چیز کی طرف۔''

اَنْـكَرُ (افعل التفضیل) : زیادہ برا' زیادہ نا گوار۔ ﴿اِنَّ اَنْـكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۵﴾ (لقمٰن) ''بے شک نا گوار ترین آواز گدھے کی آواز ہے۔''

اَنْـكَرَ (افعال) اِنْكَارًا : واقفیت کا اقرار نہ کرنا' پہچاننے سے انکار کرنا۔ ﴿يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا﴾ (النحل: ۸۳) ''وہ لوگ پہچانتے ہیں اللہ کی نعمت کو' پھر پہچاننے سے انکار کرتے ہیں اس کا۔''

مُنْكِرٌ (اسم الفاعل) : نہ پہچاننے والا' انکار کرنے والا۔ ﴿فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْـكِرُوْنَ﴾ (یوسف) ''تو اس نے پہچانا ان کو اور وہ لوگ اس کو نہ پہچاننے والے تھے۔'' ﴿قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ﴾ (النحل: ۲۲) ''ان کے دل انکار کرنے والے ہیں۔''

مُنْكَرٌ : اسم المفعول ہے اور صفت کے طور پر بھی آتا ہے۔ (۱) نہ پہچانا ہوا' اجنبی۔ (۲) نا گواری۔ (۳) برائی (جس کو انسانی فطرت نہیں پہچانتی)۔ ﴿اِنَّـكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ﴾ (الحجر) ''بے شک تم لوگ ایک اجنبی قوم ہو۔'' ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ﴾ (الحج: ۷۲) ''اور جب کبھی پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ان کو ہماری واضح آیات تو تُو دیکھتا ہے ان کے چہروں میں جنہوں نے کفر کیا' نا گواری کو)۔'' برائی کے مفہوم میں آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے۔

نَـكَّرَ (تفعیل) تَنْكِيْرًا : کسی کو ناقابل پہچان بنانا' کسی کا بھیس بدلنا۔

نَـكِّرْ (فعل امر) : تو بھیس بدل دے۔ ﴿نَـكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا﴾ (النمل: ۴۱) ''تم لوگ بھیس بدل دو اس کے لیے اس کے تخت کا۔''

ترکیب: ''وَلْتَـكُنْ''، ''كَانَ'' کا فعل امر غائب میں واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور یہ

''كَانَ'' تامہ ہے۔ ''اُمَّـةٌ'' اس کا فاعل ہے اور نکرہ مخصوصہ ہے۔ ''يَدْعُوْنَ' يَاْمُرُوْنَ'' اور ''يَنْهَوْنَ'' اس کی خصوصیت ہیں۔ ''اُمَّـةٌ'' مؤنث غیر حقیقی ہے اس لیے مذکر کے صیغے بھی جائز ہیں اور اسم جمع ہے' اس لیے جمع کے صیغے آئے ہیں۔ ''تَفَرَّقُوْا'' فعل ماضی کا جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ ''جَاءَ'' کا فاعل ''اَلْاٰيٰتُ'' محذوف ہے۔ ''اَلْبَيِّنٰتُ'' اس کی صفت ہے اور مؤنث غیر حقیقی ہونے کی وجہ سے فعل ''جَاءَ تْ'' کے بجائے ''جَاءَ'' بھی درست ہے۔

ترجمہ:

وَلْتَكُنْ: اور چاہیے کہ ہو	مِّنْكُمْ: تم لوگوں میں
اُمَّـةٌ: ایک گروہ جو	يَّدْعُوْنَ: دعوت دے
اِلَى الْخَيْرِ: بھلائی کی طرف	وَيَاْمُرُوْنَ: اور تاکید کرے
بِالْمَعْرُوْفِ: نیکی کی	وَيَنْهَوْنَ: اور منع کرے
عَنِ الْمُنْكَرِ: برائی سے	وَاُولٰٓئِكَ: اور وہ لوگ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ: ہی مراد پانے والے ہیں	وَلَا تَكُوْنُوْا: اور تم لوگ مت ہونا
كَالَّذِيْنَ: ان کی مانند جو	تَفَرَّقُوْا: پھٹ کر الگ الگ ہوئے
وَاخْتَلَفُوْا: اور اختلاف کیا	مِنْۢ بَعْدِ مَا: اس کے بعد کہ جو
جَآءَهُمُ: آئیں ان کے پاس	الْبَيِّنٰتُ: واضح (نشانیاں)
وَاُولٰٓئِكَ: اور یہ وہ لوگ ہیں	لَهُمْ: جن کے لیے
عَذَابٌ عَظِيْمٌ: ایک عظیم عذاب ہے	

نوٹ: ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں سے کچھ زیادہ وسیع النظر قسم کے افراد اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر فرض تو ہے لیکن یہ فرضِ کفایہ ہے' فرضِ عین نہیں ہے۔ لیکن علامہ ابن کثیرؒ نے یہ مطلب نہیں لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''یہ یاد رہے کہ ہر ہر متنفس پر تبلیغ حق فرض ہے' تاہم ایک جماعت تو خاص اسی کام میں مشغول رہنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے اسے ہاتھ سے دفع کر دے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے۔ اگر یہ بھی نہ کر سکتا ہو تو اپنے دل سے اسے متغیر کرے۔ یہ ضعیف ترین ایمان ہے''۔ (تفسیر ابن کثیر)

مفتی محمد شفیعؒ کا کہنا ہے کہ ''اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ڈالنے کے لیے قرآن کریم میں بہت سے واضح ارشادات وارد ہوئے ہیں''۔ انہوں نے سورۃ العصر کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق خسارے سے صرف وہی انسان بچے گا جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ دوسروں کو حق اور صبر کی تاکید کرے گا۔ نیز آل عمران: ۱۱۰ کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں پوری اُمت پر یہ

فرض عائد کیا گیا ہے۔(معارف القرآن)

ہمارے لبرل بھائیوں کے ذہنوں میں اس ضمن میں اور بھی بہت سی الجھنیں ہیں۔ان کا تسلی بخش جواب مفتی محمد شفیعؒ نے اس آیت کی تفسیر میں دیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ان میں سے چند اہم نکات ہم اپنے الفاظ میں دے رہے ہیں۔

(۱) خیر کی تعریف خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرما دی ہے کہ خیر سے مراد قرآن اور میری سنت کا اتباع ہے۔اسی طرح منکر میں وہ تمام برائیاں داخل ہیں جن کا آپ ﷺ کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم و معروف ہو۔

(۲) کسی شخص کو اگر قرآن و حدیث کے مطابق معروف اور منکر کا علم نہیں تو اس پر یہ علم حاصل کرنا فرض ہے' لیکن اس خدمت کے لیے کھڑا ہونا جائز نہیں ہے۔اس لیے جاہل واعظین اور عوام سے سنی سنائی غلط باتوں پر لوگوں سے جھگڑا کرنا جائز نہیں۔

(۳) قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُمت کے ہر فرد پر لازم ہے۔ البتہ ہر فرد پر اس کی استطاعت اور قدرت کے مطابق یہ فریضہ عائد ہوگا۔

(٤) ایک شخص جب تک متعلقہ علم حاصل کرنے کا فرض ادا نہیں کرتا' اُس وقت تک یہ فریضہ اس کی استطاعت کے باہر ہے۔

(۵) ایک شخص کو ہاتھ سے یا زبان سے کسی برائی کو روکنے میں کوئی شدید خطرہ لاحق ہو تو یہ فریضہ اس کی قدرت سے باہر ہے' اس لیے اس کے ترک کرنے پر اس کو گناہ نہیں ہوگا۔البتہ اگر کوئی نقصان برداشت کر کے بھی یہ فریضہ سرانجام دیتا ہے تو یہ بڑی فضیلت کی بات ہے' لیکن ایسا کرنا اس پر فرض یا واجب نہیں تھا۔

(٦) جو اُمور واجب ہیں ان میں معروف کا امر اور منکر سے نہی کرنا واجب ہے اور مستحب امور میں ایسا کرنا مستحب ہے' واجب نہیں ہے۔

(۷) روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو اُمت میں مشہور و معروف اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔اجتہادی مسائل جن میں اصولِ شرعیہ کے ماتحت آراء ہو سکتی ہیں ان میں یہ روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا چاہیے۔

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

قرآن حکیم میں علم کے تفسیری معانی

حافظ محمد مشتاق ربانی

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ علم صرف جاننے کے معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے' جبکہ قرآن حکیم میں یہ کئی تفسیری معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک ہی کلمہ اگر قرآن حکیم میں کئی مقامات پر وارد ہو اور مختلف مفاہیم پیش کر رہا ہو تو اسے ''الوجوہ والنظائر'' کہتے ہیں۔ ایک ہی کلمہ کا مختلف مقامات پر وارد ہونا ''النظائر'' کہلاتا ہے اور اگر وہ مختلف مفاہیم پیش کر رہا ہو تو اسے ''الوجوہ'' کہا جاتا ہے۔ جیسے ابوعبداللہ الحسین بن محمد الدامغانی (ت ۴۷۸ھ) نے ''**الوجوہ والنظائر لالفاظ کتاب اللّٰہ العزیز**'' میں اِتَّقُوْا کے پانچ تفسیری معانی ڈرنا' عبادت کرنا' معصیت سے بچنا' توحید اختیار کرنا اور اخلاص بیان کیے ہیں۔[۱] بعض لوگ الوجوہ والنظائر کو قرآن حکیم کا معجزہ سمجھتے ہیں۔

امام السیوطیؒ نے ''**الاتقان فی علوم القرآن**'' اور امام زرکشیؒ نے ''**البرھان فی علوم القرآن**'' میں مقاتل بن سلیمان (ت ۱۵۰ھ) کی کتاب کے مقدمہ کے حوالہ سے ایک حدیث مرفوع نقل کی ہے جسے ابن سعد نے ابودرداءؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ:

((**لا یکون الرجل فقیھا کل الفقہ حتی یری للقرآن وجوھا کثیرۃ**))[۲]

''کسی شخص کو اس وقت تک مکمل تفقہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے قرآن حکیم کے ایک ہی کلمہ کے مختلف استعمالات کا علم نہ ہو۔''

اس بحث میں ہم دیکھیں گے کہ کلمہ ''علم'' قرآن حکیم میں کس کس مفہوم میں وارد ہوا ہے۔ ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی (ت ۱۹۸۵م) نے ''**الأشباہ والنظائر فی القرآن**''☆ میں علم کے تین تفسیری معانی (i) الرویۃ' (ii) العلم بعینہٖ اور (iii) الاذن بتائے ہیں[۳]۔ اسی طرح الدامغانی نے بھی اپنی کتاب ''**الوجوہ والنظائر لالفاظ کتاب اللّٰہ العزیز**'' میں علم کے وہی تین مفاہیم ذکر کیے ہیں[۴] جو مفسر مقاتل بن سلیمان نے ذکر کیے ہیں' لیکن ابوالفرج ابن الجوزی (ت ۵۹۷ھ) نے اپنی کتاب ''**نزھۃ**

☆ یہ کتاب درحقیقت مقاتل بن سلیمان بن بشیر الازدی' الخراسانی البلخی (ت ۱۵۰ھ) کی ہے جس کی شرح ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی نے کی ہے۔

الاعین النواظر فی علم الوجوہ والنظائر'' میں علم کے گیارہ تفسیری معانی لکھے ہیں[۵] جنہیں یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان کے ساتھ جن آیاتِ قرآنیہ کا حوالہ دیا گیا ہے' یہ بھی دراصل ابن الجوزیؒ ہی کی منتخب آیات ہیں' جن سے وہ استدلال کرتے ہیں۔

(۱) العلم بعینہٖ: کسی مادی ومحسوس چیز کو جاننا۔

سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۝﴾

''کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں' اللہ وہ سب جانتا ہے۔''

اسی طرح سورۃ التغابن میں فرمایا:

﴿یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَیَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝﴾

''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ وہ سب جانتا ہے' اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ سب سے واقف ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں گزرنے والے خیالوں سے بھی آگاہ ہے۔''

واضح رہے کہ علم اپنے اصل مفہوم میں قرآن حکیم میں عام مستعمل ہے۔

(۲) الرؤیۃ: رَأَی یَرَی سے مصدر ہے' بمعنی آنکھوں سے دیکھنا۔

سورۂ محمد میں فرمایا:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰہِدِیْنَ مِنْکُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ ۙ وَنَبْلُوَاَخْبَارَکُمْ ۝﴾

''اور ہم تم کو ضرور آزمائیں گے' تاکہ ہم دیکھ لیں تم میں سے جو جنگ کرنے والے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں' اور تمہارے حالات جانچ لیں۔''

امام ابن کثیرؒ (ت ۷۷۴ھ) نے ''تفسیر القرآن العظیم'' میں سورۂ محمد (ﷺ) کی اسی آیت (جس کا اوپر ذکر ہوا ہے) کے تحت ابن عباس کے حوالہ سے ﴿نَعْلَمُ﴾ کا مفہوم ''نَرٰی'' لکھا ہے[۶]۔ اکثر مفسرین کرام نے ایسی آیات کے ضمن میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ازلی اور ابدی ہے' لہٰذا ایسے مقامات پر ظاہر کرنے کا مفہوم ہوتا ہے۔ یہاں پر ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی کا انتباہ بھی پیش نظر رہے کہ یَعْلَمُ کا مترادف ''یَرٰی'' بتانا درست معلوم نہیں ہوتا' بلکہ ﴿لِیَعْلَمَ اللّٰہُ﴾ کی ترکیب میں ہر جگہ نمایاں کرنا یا ممیّز کرنا کے معانی ہوتے ہیں' کیونکہ اللہ کا علم ازلی اور ابدی ہے۔[۷]

(۳) علم بمعنی اذن (حکم): حکم اور اجازت دونوں مراد لیے جا سکتے ہیں۔

سورۂ ہود میں فرمایا:

﴿فَاِلَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾

''پس اگر وہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ (قرآن) اللہ کے علم (یعنی اذن) سے اُترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو تمہیں بھی اسلام قبول کر لینا چاہیے۔''

ابن جریر الطبریؒ (ت ۳۱۰ھ) اپنی تفسیر ''جامع البیان عن تأویل آی القرآن'' میں ﴿بِعِلْمِ اللّٰهِ﴾ سے مراد اللہ کا حکم لیتے ہیں۔(۸)

اسی طرح سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝﴾

''لیکن اللہ نے جو کتاب تم پر اتاری ہے اس کی بابت اللہ گواہی دیتا ہے کہ اُس نے اپنے اِذن سے اتاری ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں۔ اور گواہ تو اللہ ہی کافی ہے''۔

(۴) القرآن: سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

''اور اگر تم نے اس علم (یعنی قرآن) کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں سے ہوگا''

یہ آیت تحویل قبلہ کے پس منظر میں ہے۔ محمود الآلوسی البغدادی (ت ۱۲۷۰ھ) نے ''روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی'' میں یہاں ''العلم'' سے مراد القرآن لیا ہے۔(۹)

(۵) الکتاب: سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا﴾ (آیت ۱۴۸)

''کیا تمہارے پاس کوئی علم (یعنی کتاب) ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟''

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ ''جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے''۔ اس ضمن میں ان سے کہا جا رہا ہے کہ ''کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟'' نواب صدیق حسن خان القنوجی (ت ۱۳۰۷ھ) نے ''فتح البیان فی مقاصد القرآن'' میں ''العلم'' سے مراد یہاں صحیح دلیل کے علاوہ کتاب مراد لی ہے، جس میں یہ درج ہو کہ اللہ تمہارے شرک کے عمل سے راضی ہے۔(۱۰)

(۶) الرسول: سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ﴾ (آیت ۱۹)

''اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کیے جنہیں کتاب دی گئی تھی' ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے رسول آ جانے کے بعد' آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا''۔

سورۂ آل عمران میں زیادہ تر مخاطب نصاریٰ ہیں' جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ اس تناظر میں اگر دیکھیں تو ''**العلم**'' سے مراد ''رسول'' کا مفہوم قریب ترین ہے۔ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی (ت ۱۳۹۶ھ) کی تفسیر ''**تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر المنان**'' میں اس آیت کی تشریح سے واضح طور پر مترشح ہوتا ہے کہ وہ ''**العلم**'' سے مراد یہاں محمد ﷺ لیتے ہیں۔[۱۱]

(۷) التفقّہ: سوجھ بوجھ' گہری بصیرت۔

سورۃ الانبیاء میں فرمایا:

﴿وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾ (آیت ۷۴)

''اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم بخشا''۔

امام القرطبی (ت ۶۸۱ھ) نے ''**الجامع لأحکام القرآن**'' میں ''عِلْمًا'' سے یہاں ''**فهما**'' مراد لیا ہے[۱۲] لیکن کئی دوسرے مفسرین اس سے علم شریعت اور نبوت مراد لیتے ہیں۔

(۸) العقل: سورۃ القصص میں فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ (آیت ۸۰)

''مگر جو لوگ عقل والے تھے وہ کہنے لگے افسوس تمہارے حال پر' اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے''۔

اس آیت کا پس منظر قارون ہے' جب وہ اپنی دولت کی بھرپور نمائش کے لیے نکلا تو مادہ پرست لوگ اسے اچھی قسمت والا سمجھنے لگے' جبکہ کچھ دوسرے لوگ جو عقل مند تھے' وہ اس کی دولت کو حقیقت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ سید قطب شہیدؒ نے ''**فی ظلال القرآن**'' میں یہاں ''**العِلم**'' کا مفہوم ''الشعور'' لکھا ہے کہ اللہ کے اجر و ثواب کو دنیا کی زیب و زینت سے بلند تر سمجھنے کا شعور ایک بلند مقام ہے' جو صرف صبر کرنے والوں کو ملتا ہے۔[۱۳]

(۹) التمییز: جدا جدا کرنا۔

سورۂ آل عمران میں فرمایا:

﴿وَمَا اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ﴾ (آیت ۱۶۷)

’’جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ تمیز پیدا کرے کہ تم میں سے مؤمن کون ہیں اور منافق کون۔‘‘

یہ آیت غزوۂ احد کے پس منظر میں ہے۔ امام القرطبیؒ نے اپنی تفسیر ’’الجامع لأحکام القرآن‘‘ میں ’’لِیَعْلَمَ‘‘ کا مفہوم ’’لِیَمِیْزَ‘‘ لکھا ہے۔(١٤)

اس آیت کے ضمن میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (ت ۱۹۴۹ء) لکھتے ہیں:

’’غزوۂ اُحد میں اے مسلمانو! تمہاری وجہ سے صورت حال ایسی ہوگئی کہ کلی غلبہ عطا کرنے میں مصلحت نہ تھی۔ بہر حال جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کے حکم ومشیت سے ہوا، جس کا سبب تم تھے اور حکمت یہ تھی کہ ایک طرف ہر مؤمن ومخلص کے ایمان واخلاص اور دوسری جانب ہر منافق کا درجہ ظاہر ہو جائے، کھرے کھوٹے اور کچے پکے میں کسی کو کچھ التباس نہ رہے‘‘۔(١٥)

اس اقتباس سے بھی پتہ چل رہا ہے کہ مولاناؒ ’’یعلم‘‘ کا مطلب تمیز پیدا کرنا لے رہے ہیں۔

(۱۰) <u>الفضل</u>: ایسی خوبی جس کی بنا پر کسی کو دوسرے پر ترجیح حاصل ہو۔

سورۃ القصص میں فرمایا:

﴿قَالَ اِنَّمَا اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ﴾ (آیت ۷۸)

’’اس نے کہا: یہ سب کچھ تو مجھے اس فضل کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے۔‘‘

یہ آیت قارون کے بارے میں ہے کہ اُس نے کہا کہ میرے اندر جو صلاحیتیں اور قابلیت ہے، اس کی بنا پر مجھ پر فضل کیا گیا۔ گویا یہاں ’’علم‘‘ کا مفہوم ’’الفضل‘‘ ہے، جیسا کہ ابن عادل الحنبلی (ت ۸۸۰ھ) نے ’’اللّباب فی علوم الکتاب‘‘ میں البغویؒ کے حوالے سے الفضل مراد لیا ہے(١٦)۔ لیکن اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ قارون علم کیمیا کا ماہر تھا اور وہ دولت کمانے کے ڈھنگ سے بخوبی واقف تھا، گویا اسے حسن تدبیر کا ملکہ اور مہارتِ فن حاصل تھا۔ لہٰذا اس نے کہا کہ یہ دولت میری صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا مفہوم رکھنے والی آیت سورۃ الزمر میں بھی ہے:

﴿فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَا اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ﴾ (آیت ۴۹)

’’پس جب انسان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے کوئی خاص نعمت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے۔‘‘

اس آیت میں ’’عَلٰی عِلْمٍ‘‘ سے الزمخشری (ت ۵۳۸ھ) نے ’’الکشاف‘‘ میں فضل واستحقاق کا مفہوم بیان کیا ہے۔(١٧)

(۱۱) <u>جسے وہ علم سمجھتے ہیں حقیقت میں جہالت ہے؟</u>: سورۃ المؤمن (غافر) میں ارشاد ہے:

﴿فَلَمَّا جَاءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ.....﴾(آیت۸۳)

''جب ان کے رسول ان کے پاس بینات لے کر آئے تو وہ اسی علم میں مگن رہے جو اُن کے پاس تھا.....''

﴿بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ﴾ کا ایک مفہوم ابن عادل الحنبلیؒ (ت ۸۸۰ھ) نے اپنی تفسیر ''اللباب فی علوم الکتاب'' میں ''لیس عندھم علم'' یعنی انہیں علم حاصل نہیں''(۱۸) بتایا ہے۔ گویا وہ اپنے طور پر جسے علم سمجھ رہے ہیں حقیقت میں وہ علم نہیں ہے۔ جیسا کہ مفتی محمد شفیعؒ (ت ۱۹۷۶م) نے ''معارف القرآن'' میں بحوالہ تفسیر مظہری لکھا ہے کہ ''یہ علم جس پر کفار خوش اور مگن تھے اور اس کے مقابلہ میں انبیاء کے علوم کو رد کرتے تھے، یا تو ان کا جہل مرکب تھا کہ ناحق اور باطل کو حق و صحیح سمجھ بیٹھتے تھے، جیسے یونانی فلاسفہ کے بیشتر علوم و تحقیقات جو الٰہیات سے متعلق ہیں، اسی نمونہ کی ہیں جن کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان کو جہل مرکب تو کہہ سکتے ہیں مگر ان کا نام علم رکھنا علم کی توہین ہے یا پھر ان کے اس علم سے مراد دنیا کی تجارت، صنعت وغیرہ کا علم ہے، جس میں یہ لوگ فی الواقع ماہر تھے اور قرآن حکیم نے ان کے اس علم کا ذکر سورۃ الروم میں اس طرح فرمایا ہے:

﴿يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۖ وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ ۝﴾

''وہ لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں، اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں۔''

متذکرہ بالا آیت میں بھی اگر یہی علم ظاہر دنیا کا مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ چونکہ قیامت اور آخرت کے منکر اور وہاں کی راحت سے جاہل و غافل ہیں، اس لیے اپنے اسی ظاہری ہنر پر خوش اور مگن ہو کر انبیاء کے علوم کی طرف توجہ نہیں دیتے۔(۱۹)

یاد رہے کہ علم کے جو گیارہ معانی بیان کیے گئے ہیں، یہ ابن الجوزیؒ کے نزدیک ہیں، جن کی تائید اور توثیق دیگر مفسرین سے بھی ہوگئی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر صاحب تفسیر نے ان مقامات و مواضع پر وہی معانی لیے ہوں جو ابن الجوزیؒ بیان کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر تفسیری معانی کی گنجائش کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ علم ''یقین'' کے مفہوم میں بھی وارد ہوا ہے۔ سورۃ الممتحنۃ میں ہے:

﴿فَاِنۡ عَلِمۡتُمُوۡهُنَّ مُؤۡمِنٰتٍ﴾ (آیت۱۰)

''پس اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مؤمن ہیں''۔

یہاں پر عربی کی مشہور لغت ''المعجم الوسیط'' میں عَلِمۡتُمُوۡهُنَّ کا مفہوم ''ان کے بارے میں یقین ہو جائے''(۲۰) لکھا ہوا ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت ﴿وَكُلًّا اٰتَيۡنَا حُكۡمًا وَّعِلۡمًا﴾ (آیت ۷۹) میں ''علما'' سے مراد مولانا امین احسن اصلاحی (ت ۱۹۹۷م) ''نبوت'' کا مفہوم لیتے ہیں(۲۱)۔ (واللہ اعلم)

مال و دولت، عزت، قوت اور تندرستی وغیرہ کی طرح علم بھی ایک نعمت خداوندی ہے۔ یہ علم صرف کسی ڈگری کے حاصل ہو جانے کا نام نہیں ہے، نہ ہی اس کو صرف سائنسی علوم تک محدود کیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی

سائنس کو علم کے زمرے سے نکالا جا سکتا ہے، بلکہ یہ ایک جامع اصطلاح ہے، جس کا ذریعہ وحی الٰہی اور ذہنی جستجو ہے۔ اس وقت انسانی علم نبوت و رسالت اور وحی الٰہی سے اپنا ناطہ توڑ چکا ہے اور صرف اس ظاہری کائنات تک محدود ہو چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موجودہ علم میں وحی کی پیوند کاری کی جائے۔ جیسا کہ علامہ محمد اقبال (ت ۱۹۳۸م) ''بالِ جبریل'' میں فرماتے ہیں:

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی(۲۲)

اسی طرح وہ ضرب کلیم میں نظم ''علم اور دین'' میں فرماتے ہیں:

وہ علم، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم(۲۳)

حواشی

(۱) الدامغانی، ابوعبداللّٰہ، الحسین بن محمد، الوجوہ والنظائر لالفاظ کتاب اللّٰہ العزیز، ص ۸۷۔
(۲) السّیوطی، جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، ۴۲۹/۱۔ الزرکشّی، بدر الدین محمد بن عبداللّٰہ، البرہان فی علومِ الکتاب، ج۱، ص۱۰۲۔
(۳) ابوالنّصر محمد خالدی، الأشباہ والنظائر فی القرآن، ص ۴۰۷۔
(۴) الدامغانی، الوجوہ والنظائر لالفاظ کتاب اللّٰہ العزیز، ص ۳۳۴۔
(۵) ابن الجوزی، ابوالفرج عبدالرحمٰن، نزھۃ الاعین النواظر فی علمِ الوجوہ والنظائر، ص ۴۵۱۔
(۶) امام ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۴، ص۲۳۱۔
(۷) ابوالنّصر محمد خالدی، الأشباہ والنظائر فی القرآن، ص ۴۰۸۔
(۸) ابن جریر الطّبری، جامعُ البیان عن تاویل آی القران، ج۷، ص۴۵۹۰۔
(۹) محمود الالوسی البغدادی، روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی، ج۲، ص۱۳۔
(۱۰) القنوجی، ابوالطیب صدیق بن حسن بن علی الحسین البخاری، فتح البیان فی مقاصد القرآن، ج۴، ص۲۶۹۔
(۱۱) السعدی، عبدالرحمٰن بن ناصر، تیسیر الکریم فی تفسیر کلام المنان، ج۱، ص۳۶۶۔
(۱۲) القرطبی، ابوعبداللّٰہ محمد بن احمد الانصاری، الجامع لاحکام القرآن، ج۶، ص ۲۰۲۔
(۱۳) سید قطب شہید، فی ظلال القرآن، ج۶، ص ۹۵۔
(۱۴) امام القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج۲، ص ۱۷۰۔
(۱۵) شبیر احمد عثمانی، تفسیر عثمانی، سورۃ آل عمران کی آیت ۱۶۷ کا حاشیہ۱، ص ۹۳۔
(۱۶) ابن عادل الحنبلی، اللّباب فی علوم الکتاب، ج۱۵، ص ۲۹۲۔

(۱۷) الزمخشری، ابوالقاسم جار اللّٰہ محمود بن عمر بن محمد، الکشّاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التأویل، ج٤، ص ١٢٨۔
(۱۸) ابن عادل الحنبلی، اللّباب فی علوم الکتاب، ج١٧، ص ٩٣۔
(۱۹) مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ج٧، ص ٦٢٣۔
(۲۰) الدکتور ابراھیم وآخرون، المعجم الوسیط، ج٢، ص ٦٢٤۔
(۲۱) مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، ج٥، ص ١٧٢۔
(۲۲) علامہ محمد اقبال، بال جبریل، ص ١٢۔
(۲۳) علامہ محمد اقبال، ضربِ کلیم، ص ٢٦۔

❁❁❁

بقیہ : حرفِ اوّل

زیرِنظر شمارے میں بعض نئے نکات اور تصریحات کے علاوہ ایک معروف فقہی دبستان یعنی حنفی مکتبِ فکر کے تصورِ سنت کو موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں نکھار کر پیش کیا ہے۔

❁ عصرِ حاضر کی بعض احیائی تحریکوں سے وابستہ کچھ جوشیلے نوجوانوں کے خیال میں مسلح جدوجہد ہی اسلامی انقلاب برپا کرنے کا واحد راستہ ہے۔ دعوت وتبلیغ اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر ومصابرت کا رویہ ان کے نزدیک ناقابلِ عمل ہے، کیونکہ ان کے مطابق یہ ''مکی دور'' سے متعلق تھا جو کہ اب منسوخ ہو چکا ہے۔ جناب اویس پاشا نے اپنے مضمون ''غلبہ اسلام کا طریقہ کار۔ ایک اشکال کا جائزہ'' میں اسی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ ادبیت کا رنگ لیے ہوئے یہ تحریر سنجیدہ اور علمی انداز میں لکھی گئی ہے۔

❁ مستقل سلسلوں میں جناب لطف الرحمٰن خان کا ''ترجمہ قرآن مجید مع صرفی ونحوی تشریح''، حکمتِ نبویؐ کے تحت جناب محمد یونس جنجوعہ صاحب کی تشریح حدیث اور تبصرۂ کتب بھی شمارے کا حصہ ہے۔ علاوہ ازیں محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کا انگریزی دورۂ ترجمۂ قرآن The Message of The Quran بھی شاملِ اشاعت ہے جو انگریزی دان طبقے کے لیے فہمِ قرآن کا ایک مفید ذریعہ ہے۔

باری تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور ہمیں ہر لمحہ اپنی مرضیات سے نوازتا رہے۔

آمین یا الٰہ العالمین!

غلبۂ اسلام کا طریقہ کار

ایک اشکال کا جائزہ

اویس پاشا

''اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے غلبہ چاہتا ہے''۔ ماجرا کچھ یوں ہے کہ یہ فقرہ آج ایک خاص تصورِ دین کا عکاس ہے۔ اِس عبارت کو سمجھنے کے لیے گزشتہ صدی کے فکری رجحانات اور ان کے اظہار کے لیے وضع کردہ خاص محاورے اور اصطلاحات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ نسل انسانی کے اجتماعی شعور نے جب اپنے گزشتہ مشاہدات و تجربات کی روشنی میں اپنی اجتماعیت کو ایک مربوط نظام کی شکل دینے کی کوشش کی اور اِس کی پشت پر افراط و تفریط پر مبنی خالص مادی نقطۂ نظر سے مختلف فکری استدلال بھی قائم کیے، تو بالکل فطری تقاضے کے طور پر مسلمان اہل علم نے دین اسلام کی ''تعبیر'' وقت کے محاورے اور اصطلاح کو سامنے رکھتے ہوئے کی۔ یہ اِسی کا مظہر ہے کہ آج ہم اپنی روزمرہ کی زبان میں اِس جیسے کئی جملے استعمال کرتے ہیں کہ ''اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اسلام کا معاشرتی نظام، سماجی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام وغیرہ''۔ اِس تعبیر کے ساتھ جو ایک خاص جذبہ کارفرما تھا اُسے خود شعوری یا احساسِ بیداری کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں میں یہ احساس عام ہوا کہ نظاموں کی اس کشاکش کے درمیان، جبکہ ہر قوم اپنے افراط و تفریط پر مبنی مادی، خدا بے زار نظامِ حیات کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتی ہے، ہم بھی ایک نظامِ حیات کے دعوے دار ہیں، جس کی ترتیب و تدوین وحی و رسالت کے ہاتھوں ہوئی ہے اور اِسی پر عمل پیرا ہو کر ہم نے اِس دنیا پر کئی صدیوں تک حکومت کی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اِسی فکری و نظری لہر کے نتیجے میں تمام بلادِ اسلامیہ میں مختلف تحریکات غلبہ و اقامت دین یا اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی آرزو کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترتی ہیں۔ یہی وہ موقع ہے کہ جب اُمت مسلمہ کے فکری قائدین نے اِس قافلہ کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور اس طرح احیاءِ اسلام کا عمل جاری ہوا۔

ان احیائی تحریکوں میں ایک نئے عنصر کا ظہور ماضی قریب میں ہوا ہے۔ غلبہ و اقامت دین کے لیے کام کرنے والی ان تحریکات پر قریب قریب ایک صدی مکمل ہونے کو ہے مگر واقعاتی دنیا میں کوئی قابل ذکر تبدیلی رونما نہیں ہوئی، یعنی جو نتائج مطلوب تھے وہ حاصل نہیں ہوئے، اِلّا یہ کہ کچھ صالحین مسلم معاشروں

میں سے ان تحریکات کے عنوان سے مجتمع ہو گئے۔ ان نتائج کے سامنے آنے پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اپنے کام پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے اور خامیوں، کوتاہیوں کا ازالہ کرتے ہوئے مستقبل کے لیے خود احتسابی کے ساتھ پرجوش انداز میں سرگرم عمل رہتے۔ مگر بدقسمتی سے انسان جلد باز واقع ہوا ہے۔ نیا منظر نامہ یوں مرتب ہوا کہ ان تحریکات کے کچھ پرجوش اور سرگرم عناصر اپنے گزشتہ سوچ سمجھے، معتدل اور محتاط طریقہ کار کے بارے میں ناامیدی اور شکوک وشبہات کا شکار ہو گئے، جیسا کہ فکری خلا کا کوئی وجود نہیں اور انسان کسی صحیح یا غلط استدلال کے اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ چنانچہ ان عناصر نے جلد بازی میں ایک نئی راہ اختیار کی جو کہ ہمہ گیر اسلامی تحریک کو نقصان پہنچانے کا باعث بن رہی ہے۔ اس ہنگامی صورت حال سے قبل عالمِ اسلام میں احیائی عمل کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ پہلے دعوتِ ایمانِ حقیقی، تزکیۂ نفوس، تعلیم کتاب وحکمت، تربیت وتنظیم، پھر جہاد وقتال۔ جبکہ اس جدید استدلال میں بات تکفیر سے شروع ہوتی ہے اور مجہول الہدف، بے نتیجہ قتال کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس بے اصل استدلال کو شرعی نصوص سے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان صفحات میں ہمارے پیش نظر اسی اشکال کا جائزہ لینا ہے۔

اِس امر میں تو مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ چاہے معاملات ہوں یا عبادات، معاشرت ہو یا سیاست و ریاست، عملی رہنمائی کا اصل ماخذ قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت وسیرت ہے۔ جس طرح یہ اصول دیگر دینی تعلیمات کے لیے صحیح ہے اِسی طرح غلبہ و اقامتِ دین یا نصبِ امامت وخلافت کے طریقہ کار، لائحہ عمل اور منہج انقلاب کے اخذ کرنے کا اولین واہم ترین ذریعہ بھی سیرتِ رسول ﷺ ہے۔ (اس فرق کے ساتھ کہ عبادات یعنی تعبدی اُمور میں اصل ''حرمت'' ہے یہاں تک کہ اُس کی حلت ثابت ہو جائے اور معاملات میں اصل ''اباحت'' ہے یہاں تک کہ اُس کی حرمت ثابت ہو جائے۔) معلوم یہ ہوا کہ مصدر و ماخذ سے متعلق کوئی اختلاف نہیں، بلکہ یہ جو تنوع ہم تحریکوں کے طریقہ کار میں پاتے ہیں یہ اصلاً اُس کے فہم اور تعبیر وتشریح میں نقطۂ نظر کی صحت وضعف کا ہے۔ واضح رہے کہ جب ہم کسی فعل کے لیے کسی واقعہ سے نظیر لیتے ہیں یا قضیۂ اولیٰ کو قضیۂ ثانیہ پر قیاس کرتے ہیں تو اِس امر کی صحت و بطلان کا انحصار دو اساسات پر ہوتا ہے، جسے اصولیین کی زبان میں اصل اور فرع یا مقیس علیہ اور مقیس کہتے ہیں۔ جب تک ہر دو اجزاء کی مکمل معرفت، اُن کے اوصاف وخواص، تعمیم وتخصیص، اطلاق وتقیید سے واقفیت اور سبب وعلت پر حکیمانہ نظر نہ ہو تو یہ استشہاد خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔

زیر نظر موضوع پر جب ہم اِس اصول کی روشنی میں غور کرتے ہیں تو تعقل کے اجزاء یہ قرار پاتے ہیں:

(۱) منہج انقلاب اخذ کرنے کے نقطۂ نظر سے رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ۔

(۲) موجودہ احوال وظروف کا دقتِ نظری سے مطالعہ۔

جزِ اول کی حیثیت اصل یا مقیس علیہ کی ہوگی اور جزِ ثانی فرع یا مقیس کہلائے گا۔ اِس بات میں کوئی ابہام نہیں ہونا چاہیے کہ دونوں اجزاء اپنی انفرادی حیثیت میں مکمل توجہ کے مستحق ہیں' کوئی بھی جزو ثانوی درجہ کا نہیں' اس لیے کہ مطلوبہ مقاصد کا حصول صرف اُسی وقت ممکن ہے جب دونوں اجزاء کی صحیح معرفت ہو۔ یعنی سیرت کے مطالعے میں خاص معروضی نقطۂ نگاہ کو اپنایا گیا ہو جو کہ تخریج منہج کے لیے مطلوب ہے۔ اور اِسی طرح اپنے زمانہ کے مزاج' تقاضے' دورِ نبویؐ کے مقابلہ میں رونما ہونے والے فرق و تفاوت' تمدنی وفکری ارتقاء اور دیگر قابل لحاظ امور کی صحیح صحیح تحقیق و تنقیح کر لی گئی ہو۔ فقہ کی اصطلاح میں پہلے جزو کو فقہ الاحکام اور دوسرے جزو کو فقہ الواقع سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ایک شخص کے لیے دونوں اجزاء کی تحقیق لازم ہے' ورنہ وہ مقاصدِ شرعیہ کی من کل الوجوہ پاسداری نہیں کر سکتا۔

اِس کو عام فہم انداز میں اِس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے ایک کاریگر فرمے یا سانچے سے کوئی شے تیار کرتا ہے۔ اِس عمل کے دو اجزاء ہیں' ایک سانچہ اور دوسرا وہ مادّہ جس کو اُس سانچے میں رکھ کر مطلوبہ شے تیار کی جاتی ہے۔ کاریگر کا دونوں اجزاء سے اچھی طرح واقف ہونا یکساں طور پر ضروری ہے۔ اُسے فرمے یا سانچے کا استعمال بھی آتا ہو اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو کہ جس مادہ کو سانچہ میں ڈالا جاتا ہے اُسے پگھلا کر استعمال کیا جاتا ہے یا کاٹ کر یا پیس کر۔ مطلوبہ شے کا حصول تبھی ممکن ہے کہ جب کاریگر دونوں اجزاء سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔

اللہ عزوجل نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو اظہارِ دین یا اقامت دین کے لیے جو منہج دے کر بھیجا وہ واضح طور پر دو مراحل میں منقسم ہے' اور ہر دو مراحل اپنی نوعیت' اثرات اور تقاضوں کے اعتبار سے مختلف اور متضاد بھی ہیں۔ اگر مکی دور میں نازل ہونے والی آیات پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو کوئی مانع نہیں جو اِس تأثر کے اخذ کرنے سے ہمیں روکتا ہو کہ اُس دَور میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے اپنے نبیؐ کو جو منہج اور طریقۂ کار دیا گیا تھا وہ دعوت اور تبلیغ ہی کا تھا جس میں ایک خاص درویشانہ رنگ غالب ہے۔ یہ دَور جہاد و قتال سے یکسر خالی ہے۔ اور اگر کہیں آیات میں لفظ جہاد استعمال ہوا ہے تو اُس کے معنی کوشش اور جدوجہد کے ہیں نہ کہ جنگ وقتال کے۔ اُس دَور کی کیفیات کا مطالعہ کیا جائے تو چند عناصر بہت واضح ہیں' جیسے یہ حکم کہ صبر کیے جاؤ' یعنی جو مصائب دعوت کے دوران پیش آئیں اُن پر صبر کی تلقین ہو رہی ہے۔ استقامت یعنی اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ہر مصیبت کو جھیل جانے کا عزم پیدا کیا جا رہا ہے۔ برائی کا بدلہ اچھائی سے دیے جانے پر اُبھارا جا رہا ہے' تزکیۂ نفوس پر زور ہے' نماز اپنی ابتدائی شکل میں ہے اور اُس کی مشق کرائی جا رہی ہے۔ اخلاق کی تہذیب مطلوب ہے۔ حق بات کہنے پر جو ذہنی یا جسمانی اذیت پہنچے اُس پر کمالِ استقامت کی ترغیب اور اس کے نتیجے میں جنت کی خوشخبری دی جا رہی ہے۔ ایمان وتقویٰ میں درجۂ احسان کی جانب پیش قدمی کے لیے تحریض وتشویق ہے۔ سیرتِ نبویؐ کے اس مرحلہ میں

مسلمانوں کی پوری جماعت کو اِس بات کی سخت تاکید تھی کہ ظلم کے جواب میں کوئی اقدام نہیں کرنا۔ یعنی مار کھانا ہے مارنا نہیں ہے' جان دینا ہے جان لینا نہیں ہے۔ اِسی حکم کو بعد میں اِن الفاظ میں ظاہر کیا گیا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ .....﴾(النساء :۷۷)

''کیا تم نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کی طرف جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو.....؟''

مکی دَور کے منہج کے برعکس ہجرت کے بعد یعنی مدنی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا عناصر میں چند اور چیزوں کا اضافہ ہوتا ہے جس سے جدوجہد کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ اب کفار کو نہ صرف اُن کے ظلم کا جواب دیا جا رہا ہے' بلکہ آگے بڑھ کر چیلنج بھی کیا جا رہا ہے۔ اُن سے دو بدو جنگ ہو رہی ہے' اُن کی گردنیں اُتاری جا رہی ہیں' کفار و مشرکین کو قیدی بنایا جا رہا ہے۔ جہاں معاہدہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے وہاں عہد و میثاق ہو رہے ہیں' جہاں عارضی صلح درکار ہے وہاں امن و صلح کی بات چیت ہو رہی ہے۔ غرض اس اُبھرتی ہوئی طاقت کے لیے جس وقت جو عمل مناسب ہے وہ اختیار کیا جاتا ہے' یہاں تک کہ اللہ عزوجل نے اسلام کو شان و شوکت سے نواز دیا۔

ہر دو مراحل کے تقاضے یکسر مختلف ہیں۔ بظاہر یہ تضاد ہے مگر حکمت دین کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر سیرت کے اِن اَدوار پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان مراحل کے مابین نسبت تضاد کی نہیں بلکہ تدریج کی ہے۔ ایک مقدم ہے اور ایک مؤخر!

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

اس حکمت کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس سب سے مقدم اور مؤثر ذریعہ قرآنِ حکیم ہے اور اُس کے بعد سیرتِ نبویؐ۔ چنانچہ ہم ذیل میں قرآن حکیم کی آیات کو مکی اور مدنی تقسیم کے اعتبار سے پیش کریں گے تاکہ بات واضح ہو جائے۔ اِس سے قبل کہ ہم آیات کی طرف متوجہ ہوں' ایک نظر علامہ زرقانیؒ کی 'مناھل الفرقان' پر ڈالتے ہیں تاکہ قرآن مجید کے فہم میں مکی اور مدنی تقسیم کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکے۔

شیخ زرقانیؒ **فائدة العلم بالمکی و المدنی** کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

من فوائده ایضًا معرفة تاریخ التشریع و تدرّجه الحکیم بوجهٍ عام' وذلک یترتّب علیه الایمان بسمو السیاسة الاسلامیّة فی تربیة الشعوب والافراد(۱)

''آیاتِ قرآنی کے مکی اور مدنی ہونے کی معرفت کے کئی فوائد ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عام طور پر احکام کے مشروع ہونے کے تاریخی پس منظر کا علم ہوتا ہے اور احکام کے نزول میں ملحوظ رکھی گئی حکیمانہ تدریج سے واقفیت ہوتی ہے اور اِس سے یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ افراد اور قبائل کی ترتیب و تہذیب میں اسلامی سیاست کا اہم کردار ہے''۔

آگے فرماتے ہیں:

والخلاصةُ أن القرآن كله قام على رعاية حال المخاطبين ' فتارةً يشتدُّ و تارةً يلين تبعاً لما يقتضه حالهم(۲)

''اور خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کل کا کل اپنے مخاطبین کے حالات کی رعایت کرتا ہے۔ کبھی یہ سختی اختیار کرتا ہے اور کبھی نرمی۔ اِس بات کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ مخاطبین کے حالات کس حکم کا تقاضا کرتے ہیں''۔

مزید لکھتے ہیں:

على أننا نلاحظ فى آفاق الآيات و السور المكية' ظاهرة تُسكت كل معاند' و تفحم كل مكابر فى هذا الموضوع وهى أن القسم المكى خلا خلوا تامًا من تشريع القتال والجهاد و المخاشفة' كما حلت أيامه فى مكة على طولها من مقاتلة القوم بمثل ما ياتون من التنكيل والمصاولة' فلم يُسمع المسلمين فيها صلصلة لسيف' ولا قَعْقَعةٌ للسلاح ولا زحف على عدو انما هو الصبر والعفو والمحاملة والمحاسفة(ایضاً)

''ہم دیکھتے ہیں کہ مکی آیات اور صورتوں میں یہ وصف ظاہر ہے کہ اِس میں ہر معاند کا (دلیل سے) منہ بند کرایا گیا ہے اور ہر متکبر کو (برہان اور حجت سے) چپ کرا دیا جاتا ہے۔ اور یہ کہ مکی سورتیں مکمل طور پر جہاد وقتال کے اَحکام سے خالی ہیں۔ جیسا کہ باوجود کفار کی ایذا رسانی کے طویل مکی دَور میں مسلمانوں کو قتال سے روک دیا گیا تھا۔ اس دَور میں مسلمانوں نے نہ تلوار کی گرج سنی نہ ہی اسلحہ کی کڑک' اور نہ ہی دشمنوں پر ہجوم کیا' بلکہ انہیں حکم تھا تو صبر و درگزر اور تحمل و برداشت کا''۔

جب قرآن حکیم کی سورتوں پر مکی اور مدنی اَدوار کے حوالے سے غور کیا جاتا ہے تو دونوں مراحل یعنی مکی دور میں صبر محض اور مدنی دور میں اقدام کی حکمت عملی اِس قدر ظاہر اور واضح ہے کہ علماء علوم القرآن کی کتب میں اِسی فرق کو مکی اور مدنی آیات کی پہچان بتاتے ہیں۔ علامہ زرقانیؒ رقم طراز ہیں:

اما ضوابط المدنى: كل سورة فيها الحدود و الفرائض فهى مدنية كل سورة فيها اذن بالجهاد و بيان احكام الجهاد فهى مدنية (ایضًا)

''مکی اور مدنی سورتوں کی پہچان کا ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ سورت جس میں حدود اور فرائض کا تذکرہ ہے وہ مدنی ہے۔ ہر وہ سورت جس میں جہاد کی اجازت اور جہاد کے احکام کا بیان ہے وہ مدنی ہے''۔

ذیل میں ہم قرآن مجید کی آیاتِ بینات کو نزول کے اعتبار سے یعنی مکی اور مدنی تقسیم کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

مکی قرآن پر ایک نظر

یہاں ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ مکی قرآن میں جس طرح صبر کی تکرار ہے اور جس طرح اِس وصف پر

زور دیا جا رہا ہے وہ بیک چشم سامنے آ جائے۔ درج ذیل آیات پر اِسی تناظر میں غور کیجیے!

☆ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بتایا جا رہا ہے کہ دعوتِ حق کے نتیجے میں آپ سے قبل بھی انبیاء ورُسل علیہم السلام کے ساتھ اِس طرح کا سلوک ہوتا رہا ہے تو پس آپ بھی صبر سے کام لیں۔ سورۃ الانعام میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِئِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾

''اور (اے نبی ﷺ) آپ سے قبل بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں' تو اس تکذیب پر اور اُن اذیتوں پر جو اُنہیں پہنچائی گئیں' انہوں نے صبر کیا یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ اور (پچھلے) رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اُس کی خبر آپ کو پہنچ ہی چکی ہے۔ تاہم اگر ان لوگوں کی بے رُخی آپ (ﷺ) پر بھاری گزر رہی ہے تو اگر آپ میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ لیں یا آسمان میں سیڑھی لگا لیں اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کیجیے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو اِن سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا' لہٰذا جذبات سے مغلوب ہونے والوں میں سے نہ ہو جائیں!''

☆ سورۃ الاعراف میں اللہ جل شانہ مسلمانوں کی جماعت کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور ثباتِ قلبی کے سامان کے لیے فرماتے ہیں کہ گزشتہ انبیاء اور اُن کے اصحاب کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا تھا۔ انہوں نے صبر کیا اور بشارت پائی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۠ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

''کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔ بے شک زمین کی ملکیت اللہ کے لیے ہے' وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے' اور انجامِ کار تو متقیوں کے لیے ہے! لوگ کہنے لگے ہمیں آپ کے آنے سے قبل بھی ستایا گیا اور آپ کے آنے کے بعد بھی۔ (تو حضرت موسیٰؑ نے) فرمایا کہ قریب ہے کہ تمہارا ربّ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلافت عطا کر دے' تاکہ وہ دیکھے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔''

مکّی سورتوں کی مزید آیات ملاحظہ کیجیے:

☆ ﴿وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ﴾ (یونس)
''اور (اے نبیؐ!) پیروی کیجیے اُس کی جو آپؐ کی جانب وحی کیا جاتا ہے اور صبر کیجیے یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردے۔ اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے''۔

☆ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ﴾ (ھود)
''سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کیے۔ اُن کے لیے ہے مغفرت اور بہت بڑا اجر''۔

☆ ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (ھود)
''پس ڈٹے رہیے (اے نبیؐ!) جیسا کہ آپؐ کو حکم ہوا ہے اور وہ بھی جس نے توبہ کی آپؐ کے ساتھ اور تم لوگ حد سے نہ بڑھنا۔ بے شک وہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو''۔

☆ اسی سورت میں آگے جا کر پھر ارشاد ہوتا ہے:
﴿وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾
''اور صبر کرو۔ بے شک اللہ ضائع نہیں کرتا نیکوکاروں کے اجر کو''

☆ سورۃ النحل بھی مکی سورت ہے۔ اس میں اہل ایمان کے اوصاف کے ضمن میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:
﴿الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾
''وہ لوگ جو صبر کی روش اختیار کرتے ہیں اور اپنے ربّ پر توکل کرتے ہیں''۔

☆ اسی سورت میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:
﴿وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾
''اور لازماً ہم صبر کرنے والوں کو اُن کا اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے''

☆ اسی سورت کے دوسرے مقام پر فرمانِ باری تعالیٰ ہے:
﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾
''پھر یہ کہ آپؐ کا ربّ اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے ہجرت کی اس کے بعد کہ وہ آزمائے گئے' پھر اُنہوں نے جہاد کیا اور صبر کیا' بے شک آپ کا ربّ اِس کے بعد بخشنے والا مہربان ہے''۔
اس آیت کے ذیل میں شاہ عبدالقادرؒ موضح القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:
''یہ آیت کریمہ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ' حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ پر ہونے والے مظالم کے بعد نازل ہوئی۔''
واضح رہے کہ اِن آیات میں جو لفظ ''جہاد'' استعمال ہوا ہے وہ اپنے لغوی معنی میں ہے' یعنی جدوجہد'

کشاکش، نہ کہ جنگ وقتال کے معنی میں۔اس لیے کہ ہم جانتے ہیں مکہ میں کسی قسم کا قتال تو کیا مدافعت کے لیے بھی ہاتھ اُٹھانے پر پابندی تھی۔اسی طرح سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

''اور وہ لوگ جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم اُنہیں ضرور اپنے راستوں کی ہدایت دیں گے۔اور یقیناً اللہ تعالیٰ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے۔''

☆ایک اور مکی سورۃ، سورۃ الفرقان میں لفظ جہاد انہی معنی میں استعمال ہوا ہے، جسے ''جہاداً کبیراً'' کہا گیا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾

''پس کافروں کا کہنا مت مانو اور ان سے اِس (قرآن) کے ساتھ جہاد کرو بڑا جہاد''۔

مراد یہ ہے کہ قرآن مجید فرقان حمید کی آیاتِ بینات کے ذریعے مسلمان مرحلۂ دعوت کے دوران احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ نظریاتی اور قولی سطح پر ادا کریں۔اس مفہوم کا تعین اس حکم صریح سے ہوتا ہے جو سیرت النبیؐ کے پورے مکی دَور پر محیط ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾(النساء: ۷۷)

''کیا آپؐ نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو بندھا رکھو؟''

جبکہ اذنِ قتال تو اثنائے سفر ہجرت بایں الفاظ نازل ہوا:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ﴾(الحج)

''اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو (قتال کرنے کی) جن سے قتال کیا گیا بسبب اس کے کہ اُن پر ظلم ہوا۔اور بے شک اللہ اُن کی مدد پر قادر ہے''۔

اس کے ذیل میں صاحب موضح القرآن لکھتے ہیں:

''جب تک حضرت ﷺ مکے میں رہے حکم تھا کہ مسلمان صبر کریں کافروں کی بدی پر۔اور جب مدینہ میں آئے تو حکم ہوا کہ جو تم سے بدی کرے تم بھی بدلا لو، جہاد شروع ہوا۔''

تفسیر طبری میں آیت ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ﴾ (العنکبوت) کا شانِ نزول اس طرح بیان ہوا ہے:

قال العوفی عن ابن عباس نزلت فی محمدﷺ واصحابہ حین اخرجوا من مکة وقال مجاهد و الضحاک وغیر واحد من السلف کابن عباس وعروة بن الزبیر وزید بن اسلم و مقاتل بن حیان و قتادة وغیرهم هذه اول آیة نزلت فی الجهاد.

وروی ابن جریر عن ابن عباس قال لما اخرج النبیﷺ من مکة قال ابو بکر: اَخرجوا نبیهم انا لله وانا الیه راجعون لیهلکن قال ابن عباس فانزل اللّٰه عزوجل:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾ قال ابو بکرؓ فعرفت انه سیکون قتال وزاد الامام أحمد قال ابن عباس وهی اول آیة نزلت فی القتال(۳)

''عوفی نے ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ یہ آیت محمد رسول اللہ ﷺ اور اُن کے اصحابؓ کے بارے میں اُس وقت نازل ہوئی جب وہ مکہ سے نکالے گئے۔ جیسے ابن عباس' عروہ بن زبیر' زید بن اسلم' مقاتل بن حیان اور قتادہ وغیرہ نے کہا کہ یہ وہ آیت ہے جو جہاد (قتال) کے بارے میں سب سے پہلے نازل کی گئی۔ اور ابن جریر نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو مکہ سے نکالا گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ''انہوں نے (کفار مکہ نے) اپنے نبیؐ کو ہجرت پر مجبور کیا —— انا للہ وانا الیہ راجعون —— تاکہ وہ خود ہلاک کیے جائیں! حضرت ابن عباس نے کہا کہ پس اللہ نے یہ آیت نازل کی: ''اجازت دی گئی اُن لوگوں کو جن سے قتال کیا گیا (قتال کی) بسبب اس کے کہ اُن پر ظلم ہوا'' تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں جان گیا کہ یہ قتال کا اذن ہے اور اس پر امام احمد نے ابن عباسؓ سے مزید نقل کیا ہے کہ یہ اولین آیت ہے جو قتال کے متعلق نازل ہوئی۔''

اس ضروری وضاحت کے بعد ہم واپس مکی قرآن کے معروضی مطالعہ کو آگے بڑھاتے ہیں۔

☆ ﴿فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّکَ تَرْضٰی﴾ (طٰہٰ)

''سو صبر کیجیے اُس پر جو یہ کہتے ہیں اور اپنے ربّ کی حمد وثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے سورج نکلنے سے قبل اور غروب ہونے سے قبل' اور رات کے اوقات میں پاکی بیان کیجیے اور صبح وشام بھی تاکہ راضی ہو جائے آپ کا ربّ''۔

☆ سورۃ النحل میں اُس عظیم الشان آیت کے بعد جس میں دعوت الی اللہ کے مراتبِ ثلاثہ بیان ہوئے ہیں' یعنی حکمت' موعظتِ حسنہ اور جدالِ احسن' یہ آیات وارد ہوئی ہیں:

﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ﴾

''اور اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اُس قدر جتنی تم کو تکلیف پہنچی' اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لیے۔ اور صبر کرو اور آپ کا صبر کرنا تو نہیں مگر اللہ ہی کی مدد سے' اور ان پر غم نہ کیجیے اور ان کے فریب کی وجہ سے تنگی محسوس نہ کیجیے''۔

اس مقام پر یہ اشتباہ ہو سکتا ہے کہ مکی دور میں بھی بدلہ لینے کی اجازت تھی' مگر جاننا چاہیے کہ اولاً تو یہ ایک انفرادی رخصت ہے نہ کہ عمومی حکم۔ پھر یہ کہ اصل حکم آیت کے ابتدائی حصہ میں پورے اہتمام کے ساتھ بیان ہوا ہے' یعنی یہ کہ اگر کوئی انفرادی طور پر جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی جوابی کارروائی کر دے تو اُس پر لازم ہے کہ برابر کا معاملہ کرے نہ کہ اقدام! ع ''دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے

کیوں!'' جبکہ مدنی دَور میں اقدام کو بھی مشروع کیا گیا۔ جیسا کہ تحریک اسلامی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مرحلہ وار اُس مقام پر پہنچ چکی تھی جب باطل پر اقدامی وار وقت کی ضرورت ہی نہیں بلکہ اہم ترین تقاضا ہوتا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں امام ابن کثیرؒ بحوالہ طبری' ابن زیدؒ کا قول نقل کرتے ہیں:

وقال ابن زيد: كانوا قد امروا بالصفح عن المشركين فأسلم رجال ذو ومنعة فقالوا يا رسول الله! لو أذن الله لنا لا نتصرنا من هؤلاء الكلاب' فنزلت هذه الآية ثم نسخ ذلک بالجهاد

''ہمیں مشرکین سے عدم تعارض کا حکم دیا گیا تھا' مگر پھر مقابلہ کی طاقت رکھنے والے لوگ بھی اسلام لے آئے تو ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اگر اللہ ہمیں اجازت دیتا تو ہم ان کتوں کا خوب مقابلہ کرتے۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور پھر عدم تعارض کا حکم جہاد سے منسوخ ہو گیا''۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ مکی دور کے آخری حصہ کا تذکرہ ہو رہا ہے جس کے بعد وہ مراحل بھی آئے جن میں کفار سے کھل کر قتال کیا گیا۔ محولہ بالا اقتباس میں جو ترشی ہے اُس سے صحابہ کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے کہ اُن کی غیرتِ ایمانی اُنہیں اقدام کی طرف اُبھار رہی ہے مگر کف ید کا حکم اتنا واضح ہے کہ کوئی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ بس دربارِ نبوتؐ میں دست بستہ اجازت طلب کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وہ ضبط ہے جو ہر انقلابی جماعت کی ابتدائی مراحل میں اہم ترین ضرورت ہے۔ (یہاں جو نسخ کا ذکر ہوا ہے اس پر ہم آگے چل کر اِن شاء اللہ الگ عنوان کے تحت گفتگو کریں گے' کیونکہ آج کل ایک خاص طرح کے لٹریچر میں اس کا بے جا طور پر استعمال ہوتا ہے۔)

سلسلۂ تنزیل کے دورِ مکی میں مرحلۂ دعوت کے ضمن میں صبر و استقامت کے حوالے سے نازل ہونے والی مزید آیات ملاحظہ فرمائیے:

☆ ﴿فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ۝﴾ (الروم)

''پس صبر کیجیے' تحقیق اللہ کا وعدہ سچا ہے (ایک روز آپ ضرور غالب ہو کر رہیں گے) اور آپ کو یقین نہ رکھنے والے لوگ ہرگز ہلکا نہ پائیں!''

☆ جب مسلمان اپنے انتہائی پر مشقت اور صبر آزما دور سے گزر رہے تھے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس موقع پر حضرت لقمان کی نصیحت کے ضمن میں صبر و استقامت کو عزم الامور قرار دے کر نبی اکرم ﷺ اور صحابہؓ کے لیے بشارت کا سامان فرمایا:

﴿يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝﴾ (لقمٰن)

''(حضرت لقمان فرماتے ہیں) اے میرے بیٹے! نماز قائم رکھ' نیکی کی تلقین کر اور برائی سے منع کر

اور جو آفت تم پر آئے اُس پر صبر کر۔ بے شک یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے''۔

مزید فرمایا:

☆ ﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ (الزمر)

''کہہ دیجیے (اے نبیؐ!) کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے ربّ کا تقویٰ اختیار کرو۔ جو لوگ اِس دنیا میں اچھے کام کریں گے اُن کے لیے (آخرت میں) اچھا بدلا ہے۔ اور اللہ کی زمین کشادہ ہے۔ بے شک صبر کرنے والوں کو اُن کا اجر بے حساب دیا جائے گا''۔

☆ ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝﴾ (الشوریٰ)

''اور البتہ جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے''۔

۞ مرحلۂ دعوت کا وہ وصف جو مخالفین دعوت پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے' وہ صبر ہی ہے' یعنی مخالفت کو برداشت کرنا اور اپنے موقف پر ڈٹے رہنا۔ چنانچہ سورۃ الاحقاف کے اخیر میں رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے حزب اللہ کے سامنے انبیاءِ سابقین علیہم السلام کا اسوہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

☆ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ......﴾ (الاحقاف)

''پس صبر کیجیے جیسا کہ صبر کیا صاحب عزم پیغمبروں نے اور ان کے معاملہ میں جلدی مت کیجیے۔ ایسا ہے کہ وہ دیکھیں گے اُس دن جس کا اُن سے وعدہ کیا جاتا ہے......''

☆ ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝﴾ (الطور)

''اور صبر کیجیے اپنے رب کے حکم کا (اپنے ربّ کے حکم کے منتظر رہیے) تحقیق آپ ہماری نگاہوں میں ہیں اور اپنے ربّ کی پاکی بیان کیجیے اس کی حمد کے ساتھ جب قیام کریں''۔

☆ ﴿فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝﴾ (المعارج)

''پس صبر کیجیے خوبصورت صبر''۔

☆ ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝﴾ (المزمل)

''اور صبر کیجیے اُس پر جو کچھ یہ کہتے ہیں اور اِن سے دوری اختیار کیجیے اچھی طرح سے''۔

☆ ﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾ (العصر)

''قسم ہے زمانے کی' بے شک انسان خسارے میں ہے' سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور آپس میں حق کی تاکید کی اور صبر کی تلقین کی''۔

۞ استقامت جو کہ مرحلۂ دعوت کے عناصر ترکیبی میں اہم عنصر ہے' سے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

☆ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ﴾ (الاحقاف)

''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا اللہ ہمارا ربّ ہے' پھر اُس پر ڈٹ گئے' تو ان پر نہ کوئی خوف ہے نہ ہی وہ غمگین ہوں گے''۔

☆ ﴿فَلِذٰلِکَ فَادۡعُ ۚ وَاسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ ۚ﴾ (الشوریٰ:۱۵)

''پس اسی طرف دعوت دیے جائیں' اور ڈٹے رہیے جیسا کہ آپ کو حکم ہوا ہے اور اُن کی خواہشات کی پیروی مت کرنا''۔

☆ سورۂ 'حٰم السجدۃ' میں تو یہ مضامین یعنی دعوت' استقامت اور صبر اپنی تکمیلی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ۝﴾

''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا اللہ ہمارا رب ہے پھر اُس پر ڈٹ گئے (استقامت اختیار کی) اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ ملال کرو اور خوشخبری سنو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے''۔

تسلسل کلام میں پھر دعوت الی اللہ کا تذکرہ آتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا.....﴾

''اور اُس سے اچھی بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور عمل کرے نیک.....؟''

پھر اگلی آیت میں دعوت کے منہج کی مزید توضیح کر دی کہ برائی اور بھلائی برابر نہیں۔ تم برائی کو بھلائی سے دور کرو' اس کے نتیجے میں تمہارے دشمن تمہارے گرویدہ ہو جائیں گے۔

اور اس سے اگلی آیت میں پھر دعوت الی اللہ کے ساتھ جو صبر و برداشت کا تعلق ہے اُس کو اِن شاندار الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿وَمَا یُلَقّٰىہَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَمَا یُلَقّٰىہَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ ۝﴾

''اور نہیں حاصل ہوتا یہ مقام مگر اُن لوگوں کو جو صبر کی روش اختیار کرتے ہیں' اور نہیں ملتا یہ مرتبہ مگر بڑے نصیب والوں کو''۔

اگر ہم اس مشق یعنی مکی قرآن میں سے مرحلۂ دعوت سے متعلق آیات کی تخریج کو جاری رکھیں تو اس کے لیے مزید کئی صفحات درکار ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو غلبہ و اقامت

دین کے لیے جو منہج دے کر بھیجا وہ واضح طور پر دو مرحلوں پر منقسم ہے' جیسا کہ قرآن وسیرت کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ایک کو ہم مکی دَور کہتے ہیں اور ایک کو مدنی دَور۔ان کے مابین اصل فرق یہ ہے کہ مکی دور میں مسلمانوں کی تعداد اور استعداد کم تھی' ان کی تربیت اور تزکیہ وتنظیم کا عمل جاری تھا اِس لیے رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کو حکم یہ تھا کہ اسلام کی دعوت اپنے قول وفعل سے دیتے رہیں۔ایمان کی پختگی' گہرائی اور گیرائی کے لیے سعیٔ پیہم جاری تھی۔اخلاق کی تہذیب' اللہ کے ساتھ عبدیت کے تعلق کو مستحکم کرنے کی کوشش اور درجۂ احسان کا حصول اُس دَور میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔منہج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صبح وشام اُس مطلوبہ استعداد اور تعداد کو حاصل کرنے کے لیے دعوت کا عمل ہر قربانی اور ایثار کے جذبہ کے ساتھ انتہائی مستقل مزاجی اور بغیر کسی مداہنت کے جاری وساری تھا۔یہی وہ تشکیلی دَور ہے جس میں رسولِ خدا ﷺ نے وحیٔ الٰہی کی روشنی میں صحابہ کرامؓ کی صورت میں وہ قوت وجمعیت فراہم کی جو کسی بھی نظام سے ٹکرانے یا بالفاظِ دیگر مسلح یا غیر مسلح اقدام کے لیے شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

مدنی قرآن پر ایک نظر

اِس عنوان کے تحت ہم قرآن مجید سے اُن آیات کا ایک انتخاب پیش کررہے ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جدوجہد کے مدنی دور پر روشنی پڑتی ہے اور اس دور کے منہج کی خاصیت یعنی جہاد وقتال کی کیفیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ وہ خصوصیات ہیں جو مکی دور میں نہیں پائی جاتیں۔مقصود اس تقابلی مطالعہ سے ہر دو مراحل کے فرق کو واضح کرنا ہے' تاکہ یہ دعویٰ پائے ثبوت کو پہنچ جائے کہ منہج اور طریقہ کار کا تعلق اصلاً مخاطبین کے اقتضاءِ حال سے ہے جو کہ احوال کے تبدیل ہونے سے بدلتا ہے۔

ان آیات کے مطالعہ کے دوران یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ جب اِن کا نزول ہوا تو یہ وہ زمانہ ہے جب تحریک اسلامی تحریک کے مرحلہ سے گزر کر ریاست اسلامی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔یعنی قتال فی سبیل اللہ کی جو شرائط شریعت اسلامیہ میں مقرر ہیں وہ پوری ہو چکی تھیں۔ارشادِ الٰہی ہے:

☆ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ)

''تم پر قتال فرض کر دیا گیا اور وہ تمہیں ناپسند ہے۔اور ممکن ہے ایک چیز تم کو ناپسند ہو جبکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔اور (اس کے برعکس) ممکن ہے ایک چیز تم کو محبوب ہو مگر اُس میں تمہارے لیے شر ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم لوگ علم نہیں رکھتے''۔

☆ ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ

صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾ (التوبة)

''قتال کرواُن لوگوں سے جو ایمان نہیں رکھتے اللہ پر اور یومِ آخرت پر اور حرام نہیں ٹھہراتے اُسے جس کو حرام کیا اللہ اور اُس کے رسولؐ نے اور قبول نہیں کرتے دینِ حق کو اُن لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں''۔

☆ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ﴾ (الحدید:٢٥)

''تحقیق ہم نے بھیجا اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ اور اُن کے ساتھ نازل کی کتاب اور میزان تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا بھی اُتارا جس میں لڑائی کی سخت صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دیگر فوائد بھی ہیں' تاکہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون اللہ اور اُس کے رسولوں کی بن دیکھے مدد کرتا ہے''۔

☆ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢١٨﴾﴾ (البقرة)

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔

☆ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾ (ال عمران:١١٠)

''تم بہترین اُمت ہو جو نکالے گئے ہو لوگوں کے لیے' تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

☆ ﴿وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٤٠﴾﴾ (الحج)

''اور اگر اللہ دور نہ کرتا بعض کو بعض سے تو ڈھائی جاتیں خانقاہیں' یہود و نصاریٰ کے عبادت خانے' معبد اور مساجد جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ اور اللہ ضرور مدد کرے گا اُس کی جو اللہ کی مدد کرے (اُس کے دشمنوں سے لڑے)۔ بے شک اللہ زور آور (اور) زبردست ہے''۔

☆ ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٦﴾﴾ (التوبة)

''اور قتال کرو مشرکوں سے اکٹھے ہو کر جیسا کہ وہ تم سے اکٹھے لڑتے ہیں۔ اور جان رکھو کہ بے شک اللہ متقیوں کے ساتھ ہے''۔

☆ ﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (التوبة)

''اگر نہیں نکلو گے تو اللہ تعالیٰ عذاب دے گا تم کو دردناک عذاب اور بدل دے گا تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو، اور تم اُس کا کچھ نقصان نہ کر پاؤ گے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

☆ ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (الانفال:۳۹)

''اور قتال کرو اُن سے یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور ہو جائے دین کل کا کل اللہ کے لیے''۔

☆ ﴿اِنَّمَا جَزٰۗؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴾ (المائدة)

''یقیناً جو لوگ لڑتے ہیں اللہ اور اُس کے رسول سے اور فساد برپا کرنے کے لیے زمین میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کیے جائیں اچھی طرح، یا سولی دیے جائیں، یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے یا ملک بدر کیے جائیں۔ یہ اُن کے لیے رسوائی ہے دنیا میں، اور آخرت میں اُن کے لیے بڑا عذاب ہے''۔

☆ ﴿فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝﴾ (النساء)

''پس قتال کیجیے اللہ کی راہ میں۔ آپ مکلّف نہیں ہیں سوائے اپنی جان کے اور رغبت دلائیے ایمان والوں کو۔ قریب ہے کہ اللہ روک دے کافروں کی جنگ کو۔ اور اللہ بہت سخت ہے جنگ میں اور بہت سخت ہے عذاب دینے میں''۔

☆ ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ﴾ (التوبة:۵)

''تو قتل کرو مشرکوں کو جہاں پاؤ اُن کو، اور پکڑو اُن کو اور گھیرو اُن کو اور اُن کی تاک میں ہر گھات میں بیٹھو''۔

☆ ﴿فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (البقرة)

''پس اگر وہ لڑیں تم سے تو اُن کو قتل کرو۔ کافروں کی ایسی ہی سزا ہے''۔

☆ ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

الْمُعْتَدِيْنَ﴿۱۹۰﴾ (البقرۃ)

''اور لڑو اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں اور دیکھو زیادتی مت کرنا۔ تحقیق اللہ حد سے بڑھنے والوں کو محبوب نہیں رکھتا''۔

☆ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾﴾ (الصف)

''تحقیق اللہ محبوب رکھتا ہے اُن لوگوں کو جو اُس کی راہ میں قتال کرتے ہیں صفیں باندھ کر' ایسے جیسے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں''۔

☆ ﴿وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾﴾ (الاحزاب)

''اور اللہ تعالیٰ اہل کتاب میں سے اُتار لایا اُن لوگوں کو اُن کے قلعوں سے جنہوں نے ان (حملہ آوروں) کی پشت پناہی کی تھی اور ڈال دیا اُن کے دلوں میں رعب کہ اب تم کچھ کو قتل کرتے ہو اور کچھ کو قیدی بناتے ہو''۔

☆ ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴿۱﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲﴾﴾ (الفتح)

''تحقیق ہم نے (اے نبیؐ!) آپ کو کھلی فتح عطا کی۔ تاکہ اللہ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور پوری کرے اپنی نعمت آپ پر اور دکھلائے آپ کو سیدھی راہ''۔

☆ ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴿۱﴾ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾﴾ (النصر)

''جب آ گئی اللہ کی نصرت اور فتح۔ اور آپ دیکھتے ہیں لوگوں کو کہ وہ داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج۔ پس اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے استغفار کیجیے۔ بے شک وہ توبہ کو قبول کرنے والا ہے''۔

قرآن مجید کی مکی اور مدنی آیات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر دو اَدوار میں مسلمانوں کا رویہ کفار سے یکسر مختلف اور متضاد رہا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکی دور میں نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم مشرکین کے مظالم کے جواب میں صبر و مصابرت کی روش پر گامزن ہیں اور اس کے برعکس مدینے میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ابوسفیان نے دربارِ نبویؐ میں دست بستہ حاضر ہو کر صلح کی درخواست کی لیکن نبی اکرم ﷺ نے صلح نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل وحیٔ الٰہی کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کی رہنمائی اور قیادت میں اختیار کیا گیا۔ مکی دَور میں پوری جدوجہد پر ایک درویشانہ اور مظلومانہ رنگ غالب ہے جبکہ مدنی دور میں اقدامی اور جارحانہ روش دکھائی دیتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے اور اس کے پیچھے

کیا حکمت کارفرما ہے؟ تو جاننا چاہیے کہ اسلام نہ ہمیشہ امن اور صلح، صبر اور درگزر کی تعلیم دیتا ہے اور نہ ہی ہر حال اور ہر جگہ جنگ و جدال اور جہاد و قتال پر اُبھارتا ہے۔ اسلام میں فی نفسہٖ نہ صلح مطلوب ہے نہ قتال، بلکہ یہ دونوں ایک خاص مقصد کے لیے حکمت عملی کے طور پر اختیار کیے جاتے ہیں، اور وہ خاص مقصد ہے اظہارِ دینِ حق، اقامت دین، قیامِ خلافت، نصب امامت، اقامۃ الدولۃ الاسلامیہ، حکومت الٰہیہ کا قیام۔ غرض نام اور اندازِ تعبیر مختلف ہیں مگر ان سب سے ایک ہی حقیقت کا اظہار مطلوب ہے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اِس آیت کو سیرت النبی ﷺ کا عمود قرار دیا ہے، یعنی یہی وہ نقطہ ہے جس کے گرد پوری تیئیس سالہ جدوجہد گردش کر رہی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳، الفتح:۲۸، الصف:۹)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (کتابِ ہدایت) اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کر دے اُسے تمام نظام ہائے حیات پر''۔

اس آیت مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت بیان ہوا ہے۔ اس نقطہ کو سمجھ لینے کے بعد سیرت کے ہر دو مراحل میں کوئی تضاد اور کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔ یعنی جب بھی جو طریقۂ کار غلبۂ دین کے لیے زیادہ مناسب تھا ہم دیکھتے ہیں کہ سیرت النبیؐ میں وہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ جب تک مکہ میں رہے مسلمانوں کے پاس اِس قدر قوت نہ تھی کہ کفر کی حکمرانی کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتے اور اُس کی جگہ خدا کی حکمرانی قائم کرتے۔ اِس لیے اقدام نہ کیا بلکہ مسلسل تن دہی کے ساتھ قوت کی فراہمی میں کوشاں رہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہاں قوت سے مراد صرف عددی قوت نہیں بلکہ ایسی عددی قوت کی فراہمی مطلوب ہے جو ایمانِ حقیقی سے وافر حصہ رکھتے ہوں اور عمل صالح پر کاربند ہوں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب مطلوبہ قوت فراہم ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے باطل کے خلاف اقدام کیا اور بھرپور کیا۔ بالآخر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلام اور اہل ایمان کو غلبہ عطا فرمایا۔ دراصل یہ نقطہ حکمت دین سے متعلق ہے اور حکمت کی ایک تعریف یوں بھی کی گئی ہے: "وضع الشئ فی محلہ". یعنی ہر چیز کو اُس کے صحیح مقام پر رکھنا۔ اللہ ہمیں حکمت عطا فرمائے۔ آمین!

کیا اب مکی منہج (مرحلۂ دعوت) منسوخ ہے؟

جیسا کہ واضح کیا گیا، منہج نبویؐ کے دو مراحل ہیں جن میں حالات کی رعایت سے مقدم و مؤخر کی نسبت ہے۔ اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض خاص ذہنی پس منظر رکھنے والے افراد جو انقلابِ اسلامی کے طریقہ کار جیسے اہم موضوع پر سنجیدہ علمی و عقلی غور و فکر کے لیے سرے سے تیار ہی نہیں اور مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال پر اس قدر انفعالی کیفیت کا شکار ہیں کہ بغیر کسی استدلال کے نری جذباتیت برتتے ہیں، اور جو منہج اُنہوں نے اپنایا ہوا ہے وہ اصلاً تو کوئی لائحہ عمل ہے ہی نہیں اِلّا یہ کہ اپنے غم و غصہ کا اظہار

ہو یا کچھ انتقامی جذبات کی تسکین ہو' سردست ہم اُن کے اِس دعویٰ بلا دلیل کا جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ کیا جہاد وقتال کی آیات کے نزول سے دعوت وتبلیغ کا منہج منسوخ ہو گیا ہے؟ وہ آیات جو مکی دَور میں ہاتھوں کو باندھے رکھنے اور برائی کا جواب اچھائی سے دینے' مظالم پر صبر کرنے اور ظلم وجبر کے جواب میں مسلسل دعوت وتنظیم کو مزید بڑھانے کا مطالبہ کرتی ہیں' منسوخ ہو چکی ہیں اُن آیات سے جو مدنی دَور میں اذنِ قتال اور پھر حکم قتال سے متعلق نازل کی گئیں؟ ہمیں اِس بات کا جائزہ لینا ہے کہ یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے؟

نسخ کا دعویٰ

ہمارے اِن نیک نیت مگر جذبات سے مغلوب بھائیوں کو اس بات کا اندازہ نہیں کہ وہ خالص علمی بحث کو چٹکیوں میں اُڑا رہے ہیں جسے اہل علم نے علوم القرآن کی کتب میں خاص اہتمام کے ساتھ ناسخ و منسوخ کے عنوان کے تحت درج کیا ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ اس ہوائی دعوے کی زد قرآن حکیم کی بیشتر محکم آیات پر پڑتی ہے جس کے بعد قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ ہمیں مخاطب ہی نہیں کرتا۔ یہ قرآن حکیم جو ابدالآباد کے لیے اور بنی نوع انسان کے ہر مسئلہ کے لیے اپنے اندر رہنمائی سموئے ہوئے ہے ہم اُسے اپنے جذبات اور جوش وخروش کے ہاتھوں مجبور ہو کر اتنا محدود کر دیں کہ اُسے غلبۂ دین کی جدوجہد کے صرف ایک دَور کے ساتھ خاص کر دیں' یہ قرآن پر ظلم اور لوگوں کو گمراہ کرنے والی بات ہے!

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ اس دعوے کے متعلق اہل علم کیا فرماتے ہیں۔

سب سے پہلے علامہ بدرالدین الزرکشیؒ کی 'البرھان فی علوم القرآن' کو لیتے ہیں جس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ یہ موقف علماءِ سوء نے نائن الیون کے بعد مسلمانوں کو مغرب کی غلامی میں دینے کے لیے اختیار کیا ہے (کیونکہ علامہ کا تعلق ساتویں صدی ہجری سے ہے)۔ علامہؒ لکھتے ہیں:

فیما یقع فیه النسخ: الجمهور علی أنه لا یقع النسخ إلا فی الأمر والنهی وزاد بعضهم الأخبار وأطلق و قید ها آخرون بالتی یراد بها الأمرو النهی(۵)

''نسخ کہاں واقع ہوتا ہے؟ جمہور اہل علم کی رائے میں نسخ صرف امر و نہی میں واقع ہوتا ہے اور بعض نے اس پر اخبار (واقعہ کا تذکرہ) کا اضافہ کیا ہے۔ کچھ نے مطلق اخبار کہا ہے اور کچھ نے صرف اُن اخبار پر نسخ کا وقوع مانا ہے جن میں امر و نہی وارد ہوتے ہیں''۔

ملاحظہ ہو کہ جن آیات کے نسخ کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ اصلاً تو شریعت سے متعلق نہیں بلکہ منہاج سے متعلق ہیں جس کے متعلق اوپر جمہور کا مسلک درج کیا گیا کہ اِس میں نسخ واقع ہی نہیں ہوتا۔ علامہ کی درج ذیل عبارت پر غور کیا جانا چاہیے جس میں انہوں نے براہِ راست ہمارے پیشِ نظر موضوع سے بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

الثالث ما أمربه لسبب ثم یزول السبب' کالأمر حین الضعف والقلة بالصبرو

بالمغفرة للذين يرجون لقاء الله و نحوه من عدم إيجاب الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر والجهاد و نحوها' ثم نسخه إيجاب ذلک وهذا ليس بنسخ فى الحقيقة وإنما هو نَسٌ' كما قال تعالىٰ : "أونُنسِهَا" فالمُنسَأ هو الأمر بالقتال' إلى أن يقوى المسلون ' و فى حال الضعف يكون الحكم وجوب الصبر على الأذى(٦)

''تیسرا یہ کہ جو حکم دیا جائے کسی سبب کی وجہ سے' پھر وہ سبب نہ رہے' جیسا کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کفار کے ظلم پر صبر کرنے اور درگزر کرنے کا' اُن مسلمانوں کو جو اللہ سے ملاقات کی امید رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح (مکی دور میں) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور جہاد کے واجب نہ ہونے کا معاملہ ہے۔ پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا وجوبِ جہاد سے اور یہ درحقیقت نسخ نہیں بلکہ یہ بھلا دینا ہے (بایں معنی کہ وقتی طور پر اس کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوْنُنْسِهَا. تو وقتی طور جو بھلا دیا گیا وہ حکم قتال تھا یہاں تک کہ مسلمان قوت حاصل کر لیں' اور ضعف کی حالت میں واجب ہے کہ تکلیف پر صبر کیا جائے''۔

یہ مشاہدہ ہے کہ نسخ کے دعوے دار اکثر ائمہ سلف کی اُن تفسیری آراء سے دلیل پکڑتے ہیں جو آیاتِ قتال کے ذیل میں ان جلیل القدر ہستیوں نے ظاہر فرمائی ہیں۔ اس کے صحیح محل اور مدعا کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بعض تابعین نے نُنْسِهَا کی تفسیر نؤخرها (یعنی مؤخر کرتے ہیں) سے کی ہے۔ (ابنِ کثیر' جلد اوّل' سورۃ البقرۃ' آیت ۱۰۶) جیسا کہ امام ابن جریر طبری سورۃ الحج کی آیت ۳۹ ﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾ (اجازت دی گئی اُن لوگوں کو جن سے قتال کیا جاتا ہے (قتال کرنے کی) بسبب اس کے کہ اُن پر ظلم ہوا) کے تحت لکھتے ہیں:

وقال ابن زيد كانوا قد أمروا بالصفح عن المشركين' فأسلم رجال ذو ومنعة فقالوا يا رسول الله لو أذن الله لنا لأ نتصرنا من هؤلاء الكلاب' فنزلت هذه الآية ثم نسخ ذلک بالجهاد(٧)

''ہمیں مشرکین سے عدم تعارض کا حکم دیا گیا تھا' مگر پھر مقابلہ کی طاقت رکھنے والے لوگ بھی اسلام لے آئے تو ہم نے عرض کی اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر اللہ ہمیں اجازت دیتا تو ہم ان کتوں سے خوب بدلہ لیتے۔ تو اِس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس نے عدم تعارض کے حکم کو منسوخ کر دیا''۔

امام سیوطیؒ نے جہاد و قتال سے متعلق اُن تمام آیات کو جنہیں بطورِ ناسخ پیش کیا جاتا ہے' اپنی کتاب 'الاتقان فی علوم القرآن' میں ناسخ و منسوخ کی بحث کے تحت جمع کر دیا ہے۔ تفصیل کے لیے اس کتاب سے رجوع کیا جائے۔

یہ اور اس جیسے دیگر مقامات جو کتبِ تفسیر میں پائے جاتے ہیں' سے متعلق اس وضاحت کی ضرورت ہے کہ یہاں نسخ کے معنی وہ نہیں جو نسخ حقیقی کے ہیں' یعنی **أن رفع الحكم بدليل شرعى ولا يجوز**

امتثاله أبدًا (دلیل شرعی کی بنیاد پر کسی حکم کا ختم ہو جانا اور پھر اس پر عمل نہ کرنا) بلکہ حکم کے فی الحال معطل اور مؤخر ہونے کے ہیں۔ اور اسی رائے کو امام جلال الدین سیوطیؒ نے اختیار کیا ہے۔

اس بارے میں علامہ زرکشیؒ کا قولِ فیصل درج ذیل ہے:

وبهذا التحقيق تبين ضعفُ ما لهج به كثير من المفسرين فى الآيات الامرة بالتخفيف إنها منسوخة بآية السيف، وليست كذلك بل هى من المنسأ بمعنى أن كل أمر ورد يجب امتثاله فى وقت ما لعلّة توجب ذلك الحكم، ثم ينتقل بانتقال تلك العلّة الى آخر، وليس بنسخ إنما النسخ الازالة حتى لا يجوز امتثاله ابدًا وإلى هذا أشار الشافعى فى "الرسالة" إلى النهى عن ادّخار لحوم الأضاحى من أجل الرأفة، ثم ورد الإذن فيه فلم يجعله منسوخا بل من باب زوال الحكم لزوال علّته وهو سبحانه و تعالىٰ حكيم أنزل على نبيه ﷺ حين ضعفه ما يليق بتلك الحال رأفة ورحمة، إذ لو وجب لاؤرث حرجا و مشقة، فلما أعز اللّٰه الاسلام وأظهره ونصره أنزل عليه من الخطاب ما يكافى تلك الحالة من مطالبة الكفار بالاسلام أو بأداء الجزية ان كانو أهل كتاب أو الاسلام أو القتل إن لم يكونوا أهل كتاب ويعود هذان الحكمان، اعنى المسالمة عند الضعف والمسايفة عند القوة بعود سببهما، وليس حكم المسايفة ناسخًا لحكم المسالمة بل كلٌّ منهما يجب امتثاله فى وقتهٖ[8]

''اور اِس تحقیق سے وہ ضعف واضح ہوتا ہے جو بہت سے مفسرین کو لاحق ہوا اُن آیات کے بارے میں جن میں بہت زیادہ تخفیف کا حکم ہے (یعنی صبر واستقامت اور عفوودرگزر کا حکم ہے) کہ یہ تمام آیات منسوخ ہیں آیۃ السیف سے۔ جب کہ معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ اوّل الذکر آیات منساء (مؤخر کردہ) کی قبیل سے ہیں، اس معنی میں کہ جو بھی حکم وارد ہوا ہے اُس کا پورا کرنا واجب ہے ایک خاص وقت میں جو علت ہے اُس حکم کے وجوب کی۔ پھر وجوب منتقل ہو جاتا ہے دوسرے حکم کی طرف علت کے منتقل ہونے کی وجہ سے۔ اور یہ ہرگز نسخ نہیں ہے، بلکہ نسخ تو وہ ہے جس پر ہمیشہ کے لیے عمل کرنا جائز نہ رہا ہو۔ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ: حدیث میں جو قربانی کے گوشت کو ذخیرہ کرنے سے منع کیا گیا[9] تو وہ بسبب رأفت ہے۔ پھر ذخیرہ کرنے کی اجازت دے دی گئی تو یہ اجازت پہلے حکم کی ناسخ نہیں ہے، بلکہ اِس میں بھی وہی حکمت کارفرما ہے کہ علت کے زائل ہونے سے حکم بھی زائل ہو گیا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ حکمت والے ہیں اِس لیے اپنے نبی ﷺ پر حالت ضعف میں وہ احکام نازل فرمائے جو اُس حال کے مطابق تھے، نرمی برتتے ہوئے رحمت کے ساتھ۔ اگر شروع ہی سے قتال کے احکام واجب کر دیے جاتے تو اِس سے شدید حرج اور مشقت لازم آتی۔ پھر جب اللہ نے اسلام کو عزت، نصرت اور غلبہ سے سرفراز

فرمایا تو آپ ﷺ پر وہ احکام نازل فرمائے جو اِس حال کے مطابق تھے۔ جیسے کفار سے اسلام کا مطالبہ (جزیرہ نمائے عرب کے کفار مراد ہیں) ورنہ اُن کا قتل کر دیا جانا' یا اگر اہل کتاب ہیں تو جزیہ کا مطالبہ۔ یہ دونوں حکم واپس آ سکتے ہیں سبب کے لوٹنے سے ۔ یعنی امن (عدم جنگ) کا اختیار کرنا کمزوری کے وقت اور جنگ وقتال کا اختیار کرنا قوت و طاقت کے وقت ۔ اور 'حکم المسایفۃ' (قتال و جنگ کا حکم) 'حکم المسالمۃ' (امن و عدم جنگ کے حکم) کے لیے ناسخ نہیں' بلکہ اُن میں سے ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ اوقات میں عمل ہوگا''۔

پس ثابت ہوا کہ نسخ کا دعویٰ مکی منہج یعنی منہج دعوت کے لیے کسی طور پر بھی ثابت نہیں۔ احوالِ واقعہ یعنی معروضی حالات کی نسبت سے معاملہ مقدم اور مؤخر کا ہے نہ کہ ناسخ ومنسوخ کا۔ نہ منہج دعوت منسوخ ہے اور نہ منہج جہاد (جیسا کہ اس کے برعکس اکثر متجد دین کا زعمِ باطل ہے)۔ منہج جہاد وقتال بھی اپنی پوری شان و شوکت' جاہ وجلال' وقار وطمطراق کے ساتھ موجود ہے اور منہج جہاد وقتال کو ساقط یا منسوخ قرار دینے والا اور اِس پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے والا مغلوب ذہنیت کا حامل' حقائق کا منکر' اسلام کی تکمیلی شان سے ناواقف اور مارِ آستین ہے۔ مگر یہاں محل گفتگو یہ ہے کہ کون سا منہج کن حالات میں زیادہ مناسب للمطلوب' مؤثر' راجح' مقدم اور مقاصد شریعت کا زیادہ محافظ اور غلبہ واقامت دین کے لیے مبنی بر ہدف ہے۔ واللہ المُستعان! بقول شاعر: ؎

گر نہ بیند بروز شپرۂ چشم　　　چشمہ آفتاب را چہ گناہ؟

اور: ؎

منکراں چوں دیدۂ شرم و حیا برہم دہد　　　تہمت آلودگی بر دامنِ مریم نہد!

ایک اشکال اور اُس کا حل

زیرِنظر مضمون کا یہ بنیادی مقدمہ ہے کہ آج مسلمانوں میں کام کرنے والی تحریکاتِ اسلامیہ کے لیے رہنمائی کا اہم ترین ذریعہ نبی اکرم ﷺ کے مکی دور کا منہج ہے۔ ہمارے نزدیک یہی وہ بنیادی مقدمہ ہے جس کو تسلیم کر لینے سے اسلامی تحریکات جو غلبہ واقامت دین کے لیے مصروف کار ہیں' صحیح راہ پر گامزن رہیں گی اور منزل بہ منزل نفاذِ اسلام اور نظامِ خلافت سے قریب تر ہوتی چلی جائیں گی اور پھر اسلامی ریاست کے قیام کے بعد اُس کے تحت اور امامِ شرعی کی اقتداء میں کفار کے خلاف قتال کو منظّم کرنے کا مرحلہ بھی آئے گا (اِن شاءاللہ)۔

اس استدلال پر ایک اعتراض یہ وارد کیا جاتا ہے کہ اگر آج جدوجہد کے لیے مکی دور کو نظیر ٹھہرایا جائے تو پھر وہ حلت وحرمت کی تفصیلات جو شریعت میں تدریجی مراحل سے گزرنے کے بعد اپنی حتمی شکل کو پہنچ چکی ہیں' درہم برہم ہو جائیں گی' شراب وسؤر کی حلت وحرمت کا سوال اُٹھ کھڑا ہوگا۔ اِس اشکال کو

ایک معترض کی زبانی سنیے! ہم عبارت نقل کیے دیتے ہیں:

''جب جہاد کے حتمی احکامات نازل کیے جا چکے تو اب کسی کو یہ حق نہیں کہ موجودہ دور کو مکی دور کے مثل قرار دے کر جہاد کو معطل کر دے' کیونکہ اِس طرح تو آج شراب وسود کی عدم حرمت کا سوال بھی کھڑا ہو جائے گا کہ مکی دور میں یہ بھی حرام نہ تھے۔ جبکہ ہمارے سامنے اللہ کا یہ حکم موجود ہے: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر میں رضامند ہو گیا''۔

الغرض ہمارے لیے شریعت کے حتمی احکام ہی حجت ہیں۔

یہ اعتراض خلط مبحث کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی نظیر یا مثال کا سو فیصد انطباق نہیں ہوتا' بلکہ کسی نسبت سے اُس کا اطلاق ہوتا ہے اور کسی پہلو سے نہیں بھی ہوتا۔ اُسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ حالات کی رعایت کے ساتھ عمل کرنا مقصود ہوتا ہے اور یہ عقل عام کی بات ہے جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ (المائدۃ:٤٨)

''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت دی اور ایک منہاج''۔

اِس آیت میں دو غور طلب الفاظ وارد ہوئے ہیں' ایک شریعت اور دوسرا منہاج۔ آیئے دیکھتے ہیں لغت میں اس کے معنی کیا ہیں' اِس آیت کی ماثور تفسیر کیا ہے اور سلف نے اِس سے کیا مراد لی ہے۔ اِس نقطے کی تفہیم سے اِن شاء اللہ محولہ بالا اشکال کا جواب بھی حاصل ہو جائے گا۔

لفظ ''الشِّرعة'' کے بارے میں علامہ آلوسی البغدادیؒ لکھتے ہیں:

'الشِّرعة' بكسر الشين' و قرأ يحيى بن ثاب بفتحها 'الشَّريعة' وهى فى الأصل الطريق الطاهر الذى يوصل منه إلى الماء والمراد بها الدين' واستعمالها فيه لكونه سبب موصلا إلى ما هو سبب للحياة الأبدية كما أن الماء سبب للحياة الفانية أو لأنه طريق إلى العمل الذى يطهر العامل عن الأوساخ المعنوية كما أن الشريعة طريق إلى الماء الذى يطهر مستعمله عن الأوساخ الحسية[۱۰]

''الشِّرعة شین کی زیر کے ساتھ ہے اور یحییٰ بن ثاب کی قراءت میں زبر کے ساتھ ہے۔ اور اِس کے اصلی معنی ہیں ایسا صاف طاہر راستہ جو پانی تک پہنچتا ہو اور اِس سے مراد دین ہے' اور اِس کا آیت میں استعمال ان معنی میں کیا گیا ہے کہ دین سبب ہے حیاتِ ابدی کا جیسا کہ پانی سبب ہے حیاتِ فانی کا۔ یا یہ کہ یہ وہ راستہ ہے جو عامل کو ایسے عمل کی طرف لے کر جاتا ہے جو اُسے معنوی

آلائشوں سے پاک کرتا ہے، جیسا کہ شریعت اُس راستہ کو کہتے ہیں جو ایسے پانی کی طرف لے کر جاتا ہے کہ اُس کا استعمال کرنے والا حسی آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے''۔

اب لفظ ''منہاج'' کے متعلق تفصیلات ملاحظہ ہوں:

''مِنۡهَاجًا'' اسم آلہ مفرد ہے اور اس کا مطلب ہے کھلا ہوا راستہ، کشادہ راستہ، روش۔ نہج، منہج اور منہاج تینوں ہم معنی ہیں۔ نَهۡجٌ باب فَتَحَ سے مصدر ہے اور مراد ہے راستہ کا کشادہ اور صاف ہونا اور اُس پر چلنا، کپڑے کا پرانا ہونا، کپڑے کو پرانا کرنا۔ اِس معنی میں باب سَمِعَ اور کَرُمَ سے بھی مستعمل ہے۔ انهاجٌ ''لازم'' بن کر بھی آتا ہے اور ''متعدی'' بھی۔ یعنی اس کا مطلب کشادہ راستہ ہونا بھی ہے اور راستہ کشادہ کرنا بھی۔ (۱۱)

ملاحظہ کیجیے کہ ائمہ سلف نے اس آیت کی تفسیر میں اِن الفاظ کے شرعی معنی کیا بیان کیے ہیں۔ امام ابن جریر طبریؒ نے اس آیت کے ذیل میں کئی روایات جمع کی ہیں جن کے طرق مختلف ہیں مگر معنی میں اشتراک ہے۔ ہم یہاں ایک روایت نقل کرتے ہیں:

حدثنا ابن بشار ، قال ثنا عبدالرحمن بن مهدى ، قال ثنا مسعر عن ابى اسحاق عن التميحى ، عن ابن عباس: لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا قَالَ سُنَّةً وَسَبِيۡلًا (۱۲)

''.....حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آیت ﴿لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا﴾ سے مراد سنت (یعنی شرعی طریقہ وحکم) اور سبیل (یعنی اس شرعی حکم اور طریقے پر چلنے کا رستہ) ہے''۔

معلوم ہوا کہ شریعت اور منہاج میں فرق ہے۔ یہ دونوں الفاظ الگ الگ مفاہیم کی ادائیگی کے لیے وارد ہوئے ہیں مگر یہ فرق ایک ہی حقیقت یعنی دین کے دو پہلوؤں کے اظہار کے اعتبار سے ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اِس آیت کے ذیل میں کافی وشافی کلام فرمایا ہے جس سے مدعا واضح ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

و(الحقيقة)حقيقة الدين، دين ربّ العالمين هى ما اتفق عليها أنبياء والمرسلون، وإن كان لكل منهم شرعة ومنهاج فالشرعة هى الشريعة قال الله تعالىٰ: ﴿ثُمَّ جَعَلۡنٰكَ عَلٰى شَرِيۡعَةٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡهَا وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ۝ اِنَّهُمۡ لَنۡ يُّغۡنُوۡا عَنۡكَ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ۝﴾ (الجاثية) .(والمنهاج) هو الطريق قال تعالىٰ: ﴿وَاَنۡ لَّوِ اسۡتَقَامُوۡا عَلَى الطَّرِيۡقَةِ لَاَسۡقَيۡنٰهُمۡ مَّآءً غَدَقًا۝ لِّنَفۡتِنَهُمۡ فِيۡهِ ؕ وَمَنۡ يُّعۡرِضۡ عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّهٖ يَسۡلُكۡهُ عَذَابًا صَعَدًا ۙ﴾ (الجنّ) فالشرعة بمنزلة الشريعة والمنهاج هو الطريق الذين سلك فيه والغاية المقصود هى حقيقة الدين وهى عبادة الله وحده لا

شریک لہ وھی حقیقۃ دین الاسلام(۳۱)

''حقیقۃ سے مراد حقیقتِ دین ہے' یعنی اللہ ربّ العالمین کا دین۔ یہ وہ دین ہے جو تمام انبیاء اور رسولوں علیہم السلام کے درمیان متفق چلا آ رہا ہے باوجود اِس کے کہ اُن سب کے لیے شریعت اور منہاج علیحدہ علیحدہ تھے۔ پس 'الشرعۃ' سے مراد شریعت ہے' جیسا کہ فرمانِ باری ہے: ''پھر ہم نے رکھا آپ کو ایک شریعت پر اس کام میں تو اسی کی پیروی کیجیے' اور ہرگز نادان لوگوں کی خواہشات کی پیروی مت کیجیے۔ وہ کام نہ آئیں گے آپ کے اللہ کے سامنے کچھ بھی' اور بے شک ظالم تو ایک دوسرے کے دوست ہیں' اور اللہ دوست رکھتا ہے متقین کو''۔ اور 'منہاج' سے مراد ہے طریقہ کار' راستہ۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ''اگر لوگ سیدھے طریقہ پر رہتے تو ہم اُنہیں پلاتے پانی بھر کر' تا کہ ہم اُن کو اس کے ذریعہ جانچیں۔ اور جو کوئی منہ موڑے اپنے ربّ کی یاد سے تو وہ اُس کو چلا دیتا ہے چڑھتے ہوئے عذاب میں''۔ پس شرعۃ سے مراد شریعت ہے اور منہاج سے مراد وہ طریقہ کار ہے جس پر چل کر غایت مقصود حاصل کیا جاتا ہے جو کہ حقیقت دین ہے اور یہ حقیقت اصلاً اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی کا نام ہے''۔

اِسی طرح کئی اور مقامات پر امام ابن تیمیہؒ نے واضح کیا ہے کہ شریعت الگ ہے اور طریقہ کار الگ ہے۔ اور یہ تمام انبیاءؑ کے لیے مختلف رہی ہیں' مگر دین کی حقیقت جو کہ عبادتِ ربّ واحد ہے' وہ تمام انبیاء اور رُسلؑ کے مابین متفق رہی ہے۔ شریعت بحث کرتی ہے حلال وحرام سے' جائز وناجائز سے' اشیاءِ استعمال کے مستحب ومکروہ ہونے سے' جبکہ منہاج اُس طریقہ کار' اُس حکمت عملی' اُس راستہ اور منہج کو کہتے ہیں جس پر کاربند ہو کر اللہ کی بندگی' اظہارِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جدوجہد کی جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج اقامت دین کے لیے رسول اللہ ﷺ کے دیے گئے دو مراحل منہج میں سے کسی کے اختیار کرنے سے شریعت کے معطل ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بے شک شریعت مکمل ہو چکی' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

یعنی آج منہج نبویؐ کے مرحلۂ دعوت پر عمل کرنے کے باوجود شریعت کے حلال وحرام پر کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ آج ہمارے لیے شریعت کے وہی احکام حجت ہیں جو تدریجی مراحل سے گزرنے کے بعد اپنی تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ آج شریعت کے بہت سے احکام پر ہمارے ہاں عمل نہیں۔ خاص طور پر شریعت اسلامی کا وہ حصہ جو ریاست سے متعلق ہے۔ جیسے نفاذِ حدود' نظامِ صلاۃ' نظامِ زکوٰۃ' کفار کے خلاف شرعی قتال یعنی جہاد فی سبیل اللہ کا قیام' امر بالمعروف ونہی عن المنکر بالید' حرمتِ سود' کفار سے جزیہ کا مطالبہ وغیرہ۔ کوئی مانے یا نہ مانے تلخ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم اپنے ربّ کے ان احکام پر اجتماعی طور پر عمل کرنے سے عاجز ہیں۔ اس کا تدارک صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ہم اس فرمانِ حقیقت بیان کی روشنی

میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدو جہد کریں۔ جیسا کہ حضرت امام مالکؒ نے فرمایا تھا کہ:

لَن یصلح آخر هذه الأمة الا بما صلح به أولها

اور منہج انقلابِ نبویؐ کی رو سے جدو جہد کی ترتیب میں مکی دَور مقدم ہے اور اسی کا ثمر ریاست مدینہ کے نام سے معروف ہے۔

نصوص سے غلط استدلال

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ آج اصل اعتبار قرآن مجید سے استنباطِ احکام کے وقت عمومِ لفظی کا ہوگا نہ کہ سببِ خصوصی کا۔ **العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب**۔ مگر یہ قاعدہ احکامِ شریعت سے متعلق ہے نہ کہ استخراجِ منہج سے۔ استخراجِ منہج میں تو اصل اعتبار ترتیبِ نزولی کا ہے اور یہ بات اتنی سامنے کی ہے کہ اس کے لیے دلائل دینے کی ضرورت نہیں۔

آج ایک خاص طرح کے لٹریچر میں جہاں بہت سے اصولی اور علمی خلط مبحث پائے جاتے ہیں اُن میں سب سے خطرناک اور کثرت سے پائی جانے والی خامی نصوص کا بے موقع انطباق ہے۔ یعنی آیاتِ قرآنی، احادیث نبویؐ، فتاویٰ واقوالِ سلف کو سیاق وسباق، ظروف واحوال سے کاٹ کر یکسر بے محل پیش کیا جاتا ہے، جو کہ نتیجہ ہے اُس حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت، انتقامی جذبات اور عالم کفر کی طرف سے ڈھائے جانے والے مسلسل ظلم و جبر کا، جس کے نتیجہ میں ہمارے یہ بھائی موجودہ پستی کی کیفیت سے باہر آنے اور غلبۂ اسلام کے لیے منہج وطریقہ کار پر سنجیدہ غور وفکر کے لیے تیار ہی نہیں۔ اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہوتے ہیں: ع

مفاہمت نہ سکھا جبر ناروا سے مجھے　　میں سربکف ہوں لڑا دے کسی بلا سے مجھے!

اور:

نصیحتم چہ کنم ناصحا چہ میدانی　　کہ من نہ معتقد مردِ عافیت جویم

مگر یہ الزام درست نہیں، کیونکہ ہم مفاہمت یا عافیت جوئی کی تعلیم نہیں دے رہے، بلکہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی نبوی حکمتِ عملی کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں۔

مفہوم اور مرادِ متکلم کے اخذ کرنے میں سیاق وسباق اور احوال وظروف کی حد درجہ اہمیت ہے۔ اس بات کا اندازہ ہم ایک سادہ سی مثال سے لگا سکتے ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے ''پانی لاؤ''۔ اب اگر وہ شخص یہ جملہ کھانے کی میز پر ادا کرے گا تو آپ اُس کو پانی کا ایک گلاس لا دیں گے۔ اگر یہی جملہ غسل خانے سے کوئی پکار کر کہے تو آپ بالٹی بھر پانی کا اہتمام کریں گے اور اگر یہی جملہ کوئی وضو خانے میں کہے تو آپ اُسے پانی کا ایک ظرف فراہم کر دیں گے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جملہ ایک ہی ہے مگر محل و مقام کے بدلنے سے تعمیلِ حکم میں کتنا فرق واقع ہوتا ہے! اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیاق وسباق اور احوال و

ظروف اور مزاج و لہجے کا متکلم کی مراد کو سمجھنے میں کتنا حصہ ہے۔

سیاق وسباق سے کاٹ کر نصوص کو پیش کرنے کے حوالے سے ہم ایک روایت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ عصر حاضر کے جہادی لٹریچر میں آپ کو بخاری و مسلم سے مروی یہ حدیث نبویؐ جا بجا ملے گی:

((اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ)) (صحيح مسلم)

''جنت تلواروں کے سائے تلے ہے''۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک روایت کا جزو ہے نہ کہ مکمل حدیث۔ اب آپ مکمل حدیث نبویؐ کا مطالعہ فرمائیں اور اندازہ لگائیں کہ سیاق وسباق کے ساتھ اِس حدیث کا کیا مفہوم ہے اور سیاق وسباق سے کاٹنے کے بعد اس کے معنی میں کیا فرق واقع ہوتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((يَا اَيُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْاَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ فَاِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ))(١٤)

''اے لوگو! دشمن سے لڑنے کی آرزو نہ کرو اور اللہ سے عافیت مانگو۔ پس جب لڑنے کی نوبت آ ہی جائے تو ڈٹ جاؤ (بھاگو نہیں) اور یہ جان رکھو کہ بہشت تلواروں کے سائے تلے ہے۔ (یعنی شہید ہوتے ہی داخل جنت ہوگے)''۔

اِس طرح کے لٹریچر کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ اِس میں ائمہ سلف کے فتاویٰ کو اُن کے پورے استدلال سے کاٹ کر الگ اور بے محل پیش کیا جاتا ہے' بغیر اِس پر غور کیے کہ صاحبِ فتویٰ نے یہ فتویٰ کن حالات میں اور کن امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیا تھا۔ اِس لیے ضروری ہے کہ فتوے کی شرعی حیثیت اور اُن عوامل کو دیکھ لیا جائے جن کا ایک مفتی فتویٰ دیتے وقت لحاظ رکھتا ہے۔ اِس سے یہ بات صاف واضح ہوجاتی ہے کہ اسلاف میں سے کسی کے فتویٰ سے منہج کے لیے دلیل پکڑنا درست نہیں' کیونکہ منہج کا تعلق اپنے زمانے کے خاص حالات سے ہوتا ہے۔ منہج کے تعین میں فیصلہ کن عامل کی حیثیت وقت کے عرف وعادت اور مصالح مرسلہ کو حاصل ہے۔ اسی لیے اہل علم کے ہاں مشہور ہے کہ: **من لم يعرف اهل زمانه فهو جاهلٌ**. کہ ''جو شخص اہل زمانہ کو نہیں جانتا وہ جاہل ہے''۔ اور عالم کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ: **ان يكون بصيرًا بزمانه** کہ وہ اپنے زمانے کی بصیرت رکھتا ہو۔ علامہ شامی کا شعر ہے: ؎

والعرف فى الشرع له اعتبار لذا عليه الحكم قد يدار

''عرف کا شریعت میں اعتبار ہے' اس لیے کہ اِس پر حکم کا مدار رکھا جاتا ہے''۔

دکتور عبدالکریم زیدان (استاذ الفقہ المقارن' جامعہ صنعاء) نے اپنی شاہکار تالیف ''اصول الدعوۃ'' میں باب نظام الافتاء کے تحت اِس موضوع پر عمدہ بحث کی ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فتویٰ کا خاص تعلق احوال' امکنۃ' ازمنۃ' ظروف اور مستفتی کے حالات سے ہوتا ہے اور یہ فتویٰ اِن امور کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے۔ یعنی **والفتوىٰ قد تتغير بتغير المكان والزمان**(١٥) قواعد فقہ کی کتب میں یہ قاعدہ کلیہ مسلّمہ

حیثیت کا حامل ہے کہ:

والحکم یدور مع العلة وجودًا و عدمًا. ''حکم کا مدار وجوداً اور عدماً علت پر رہے گا''۔

علامہ ابن عابدین الشامیؒ ''عقود رسم المفتی'' میں رقم طراز ہیں:

إن کثیرًا من الاحکام التی نص علیه المجتهد صاحب المذهب بناء علی ما کان فی عرضه وزمانه قد تغیرت بتغیر الازمان بسبب فساد اهل الزمان أو عموم الضرورة کما قد مناه من افتاء المتأخرین(۱۶)

''یقیناً بہت سے احکام جن کی تصریح صاحب مذہب مجتہد نے اپنے عرف اور اپنے زمانہ کے احوال پر بنیاد رکھتے ہوئے کی تھی وہ زمانہ کے بدلنے کی وجہ سے بدل جاتے ہیں اور یہ تبدیلی یا تو لوگوں میں بگاڑ پیدا ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے یا عمومی ضرورت کا لحاظ پیش نظر ہوتا ہے' جیسا کہ ہم متاخرین کے فتاویٰ کے ذیل میں پہلے بیان کر چکے ہیں''۔

ان تصریحات سے جہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خاص حالات میں دیے گئے فتاویٰ سے منہج کے لیے آج استدلال کرنا درست نہیں' وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آج مسلم ممالک میں ہر جگہ ایک ہی منہج کو اختیار کرنا بھی ضروری نہیں۔ جیسا کہ بعض ممالک براہِ راست کافر اور غیر ملکی افواج سے اپنی حریت و آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہاں فوری ضرورت کے پیش نظر مرحلۂ دعوت کا التزام کارگر نہیں ہے۔

آخر میں ہم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وہ نصیحت نقل کرتے ہیں جو آپ نے بزبانِ عربی' عرب ممالک کے نوجوانوں کو حج کے موقع پر مکہ معظّمہ میں ۱۳۸۲ھ میں فرمائی تھی۔ اس نصیحت کے ایک ایک حرف کو بغور پڑھنے کی ضرورت ہے۔ جب مولانا مرحوم نے یہ تقریر فرمائی تھی تو اُس وقت سے زیادہ شاید آج مسلمانوں کو اس رہنمائی کی ضرورت ہے۔ ہم اِس تقریر کا ایک جزو نقل کیے دیتے ہیں:

''اِس سلسلے میں اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انہیں خفیہ تحریکیں چلانے اور اسلحہ کے ذریعہ سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے(۱۷)۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی کی ایک صورت ہے اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعہ برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلایئے' بڑے پیمانے پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے' لوگوں کے خیالات بدلیے' اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو مسخر کیجیے۔ اِس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا وہ ایسا پائیدار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کر سکیں گے۔ جلد بازی سے کام لے کر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب رونما ہو بھی جائے تو جس راستے سے وہ آئے گا اسی راستے سے وہ مٹایا بھی جا سکے گا''(۱۸)

و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین و صلی اللّٰہ علی سیدنا محمد و آلہ و صحبہ اجمعین

حوالہ جات

١) مناهل الفرقان فی علوم القرآن للشیخ محمد عبدالعظیم الزرقانی ١٨٨/١۔

٢) مناهل الفرقان ٢٥/١۔

٣) احمد ٢١٦/١ الطبری ٦٤٣/١٨، ٦٤٣/٦١٨، ٦٤٤ والدر المنثور ٥٨/٦۔

٤) الطبری ٣٢٤/١٨۔ ابن کثیر ٥٩٤۔

٥) البرهان فی علوم القرآن ٣٣/٢۔

٦) البرهان فی علوم القرآن ٤٢/٢۔

٧) الطبری ٣٢٤/١٨۔

٨) البرهان فی علوم القرآن ٤٢/٢، ٤٣۔

٩) حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دیہاتی غرباء کی وجہ سے یہ حکم دیا تھا کہ : ((اِدَّخِرُوْا ثَلَاثًا ثُمَّ تَصَدَّقُوْا بِمَا بَقِیَ)) ''تین دن کا گوشت ذخیرہ کرلو اور باقی گوشت صدقہ کردو''۔ اس کے بعد لوگوں نے آ کر عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! لوگوں نے تو اپنی قربانی سے مشکیزے بنا لیے ہیں اور اُن میں چربی کی چکناہٹ مل رہے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا پھر کیا ہوا؟ اس پر لوگوں نے آپ ﷺ کا گزشتہ حکم بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا: ((اِنَّمَا نَهَيْتُكُمْ مِنْ اَجَلِ الرَّأْفَةِ فَكُلُوْا وَادَّخِرُوْا وَتَصَدَّقُوْا)) ''میں نے تو صرف اُن آنے والے غرباء کی سہولت کی وجہ سے تمہیں منع کیا تھا۔ اب تم کھاؤ، ذخیرہ کرو اور صدقہ کرو''۔ مسلم: ١٩٨١۔ واحمد: ٥١/٦۔ وابوداؤد ٢٨/٢۔ والنسائی ٢٣٥/٨۔

١٠) تفسیر روح المعانی للعلامة شهاب الدین آلوسی البغدادی ص١٥٣ ج ٦ آیت ٤٨ سورة المائدة۔

١١) تاج العروس، لغات القرآن جلد پنجم ص ٤٦٤۔

١٢) رقم: ٩٤٦٧ ص ٣٣٦ المجلد الرابع جامع البیان عن تاویل آی القرآن للام ابن جریر طبریؒ۔

١٣) مجموع الفتاوی للشیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ٢١٨/١١، ٢١٩۔

١٤) صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب کان النبی ﷺ اذا لم یقاتل اول النهار آخر القتال۔ وصحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب کراهة تمنی لقاء العدو والامر بالصبر عند اللقاءِ۔

١٥) اصول الدعوة لدکتور عبدالکریم زیدان، ص١٢٩، ١٨٠ بیروت۔

١٦) عقود رسم المفتی لابن عابدین الشامی ص٣٨۔

١٧) ظاہر ہے یہ ہدایت مولانا نے آج کے خاص حالات کے حوالے سے فرمائی ہے ورنہ اسلام میں مسلح کارروائی چند شرائط کے ساتھ کوئی ممنوع شے نہیں۔ (مضمون نگار)

١٨) ماخوذ از تفہیمات حصہ سوم سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ''دُنیائے اسلام میں اسلامی تحریکات کے لیے طریق کار''

اہل سنت کا تصورِ ''سنت''(۳)

حافظ محمد زبیر

سہ ماہی حکمت قرآن کے گزشتہ دو شماروں بابت اپریل تا جون ۲۰۰۸ء اور جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء میں 'اہل سُنّت کا تصور سُنّت' کے نام سے ہمارا ایک مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا' جس میں اہل سُنّت کے متوازن و معتدل تصورِ سُنّت کو قرآن و سُنّت اور ائمہ سلف کی آراء کی روشنی میں اجاگر کیا گیا تھا۔ بہت سے دوست و احباب نے اس مضمون کو سراہا اور بعض شائقین علم کی طرف سے کچھ سوالات بھی موصول ہوئے۔ عام طور پر یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ چونکہ پاکستان میں حنفی مسلک کی اکثریت ہے لہٰذا اہل سُنّت کے تصور سُنّت کے بیان میں فقہ حنفی کے متقدمین علماء کے حوالہ جات کو کثرت سے پیش کیا جائے۔ ذیل میں ہم موصول ہونے والے اشکالات و سوالات کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے ائمہ سلف کے اقوال کی روشنی میں ان کا جواب واضح کر رہے ہیں۔ ممکن حد تک کوشش کی جائے گی کہ قارئین کو اس مضمون میں حنفی فقہاء کی تحقیقات سے زیادہ سے زیادہ روشناس کرایا جائے۔ طوالت کے پیش نظر اکثر مقامات پر صرف تراجم پر اکتفا کیا گیا ہے' اگرچہ ایک تحقیقی مضمون کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ اس میں متن کو بھی شامل ہونا چاہیے۔ اس مضمون کے مطالعہ کے دوران یہ واضح رہے کہ سنت کی یہ بحث سنت سے متعلق بعض انتہا پسندانہ نظریات کے تناظر میں لکھی گئی ہے جن کی طرف ہم نے سابقہ دو اقساط میں اشارے کیے ہیں۔ اس پس منظر کے ساتھ اس مضمون کی تفہیم زیادہ مناسب اور صحیح رہے گی۔

سوال: 'سُنّت' کا لغوی مفہوم بیان کریں اور یہ بھی واضح کریں کہ عربی ادب میں لفظ 'سُنّت' کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟

جواب: ابن عادل الحنبلیؒ (متوفی ۸۶۰ھ) لکھتے ہیں:

والسنن جمع سنة و هی الطريقة التی يكون عليها الانسان و يلازمها و منه سنة الأنبياء قال خالد الهذلی لخاله أبی ذؤيب:

فلا تجزعن من سنة أنت سرتها

فأول راض سنة من يسيرها

و قال آخر:

و ان الألى بالطف من آل هاشم
تأسوا فسنوا للكرام التآسيا

و قال لبيد:

من أمة سُنّت لهم آباؤهم
و لكل قوم سنة و امامها

و قال المفضل: "السنة الأمة" وأنشد:

ما عاين الناس من فضل كفضلكم
ولا رأوا مثلكم فى سالف السنن

و لا دليل فيه لاحتمال أن يكون معناه أهل السنن قال الخليل سنّ الشيء بمعنى صوّره ومنه من حمأ مسنون أى مصور و قيل: سنّ الماء و الدرع اذا صبهما و قوله: من حمأ مسنون يجوز أن يكون منه و لكن نسبة الصب الى الطين بعيدة و قيل: مسنون أى متغير و قال بعض أهل اللغة: هى من سن الماء يسنه اذا والى صبه و السن: صب الماء و العرق نحوهما و أنشد لزهير:

نعودها الطراد كل يوم
تسن على سنابكها القرون

أى يصب عليها من العرق شبه الطريقة بالماء المصبوب فانه يتوالى جرى الماء فيه على نهج واحد فالسنة بمعنى: مفعول كالغرفة.و قيل اشتقاقها من سننت النصل أسنه سنا اذا جددته على المسن و المعنى الطريقة الحسنة يعتنى بها كما يعتنى بالنصل و نحوه.و قيل من سن الابل اذا أحسن رعايتها و المعنى: أن صاحب السنة يقوم على أصحابه كما يقوم الراعى على ابله و الفعل الذى سنه النبى ﷺ سمى سنة بمعنى: أنه ﷺ أحسن رعايته و ادامته[1]

''لفظ سنن 'سُنّت' کی جمع ہے اور 'سُنّت' سے مراد وہ طریقہ ہے جس پر انسان چلتا ہے اور اس کو لازم پکڑ لیتا ہے۔اسی معنی میں 'سنة الأنبياء' یعنی ''انبیاء کا طریقہ'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ایک شاعر خالد الہذلی نے اپنے ماموں ابوذؤیب کے بارے میں کہا ہے:

''جس رستے پر تو چل پڑے تو پھر اس پر گھبراہٹ محسوس نہ کر' کیونکہ سب سے پہلا شخص جو کسی رستے سے راضی ہوتا ہے وہ وہی ہوتا ہو جو اُس پر چلنے والا ہو''۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے:

''آل ہاشم کے وہ لوگ جو 'طف' نامی مقام میں ہیں' انہوں نے صبر کیا ہے اور ایک دوسرے کو تسلی

دیتے ہوئے باعزت لوگوں کے لیے (صبر کا) ایک طریقہ چھوڑا ہے''۔

لبید کا شعر ہے:

''وہ لوگ ایک ایسی قوم میں سے ہیں جن کے لیے ان کے آباء واجداد نے ایک طریقہ چھوڑا ہے اور ہر قوم کا ایک طریقہ اور اس کا کوئی امام ہوتا ہے''۔

'مفضل' نے کہا ہے کہ 'سُنّت' سے مراد 'امت' ہے اور اس نے دلیل کے طور پر یہ شعر پڑھا ہے:

''لوگوں نے تمہاری بزرگی جیسی بزرگی کسی میں نہیں پائی اور پچھلی اقوام میں تمہاری قوم جیسی قوم نہیں دیکھی''۔

اس میں 'سُنّت' کا معنی 'قوم' لینے میں کوئی دلیل نہیں ہے' کیونکہ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ 'سنن' سے مراد 'اہل سنن' ہوں۔ امام خلیل کا کہنا ہے کہ 'سنّ الشیء' کا معنی کسی شے کی صورت بنانا ہے اور 'حما مسنون' کا لفظ بھی اسی سے ہے' جس کا معنی 'صورت دیا گیا کیچڑ' ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ 'سن الماء و الدرع' اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ ان کو انڈیل دیا جائے اور 'حمأ مسنون' کا اس سے ہونا ممکن ہے' لیکن انڈیلنے کی مٹی کی طرف نسبت بعید ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ 'مسنون' سے مراد 'متغیر' ہے۔ بعض اہل لغت کا کہنا ہے: یہ لفظ 'سنّ الماء' سے ہے' یعنی جب کوئی شخص مسلسل پانی انڈیلتا رہے۔ پس 'سن' کا بنیادی معنی پانی اور پسینہ وغیرہ انڈیلنا ہے۔ زہیر کا شعر ہے:

''ہم ان گھوڑوں کو دشمن کا سامنا کرنے کے لیے روزانہ تیار کرتے ہیں اور ان کے کھروں پر ان کا پسینہ بہایا جاتا ہے''۔

یعنی ان پر پسینہ بہایا جاتا ہے۔ اس شعر میں رستے کو انڈیلے ہوئے پانی سے تشبیہہ دی گئی ہے' کیونکہ انڈیلے ہوئے پانی میں پانی کا بہنا مسلسل ایک ہی نہج پر ہوتا ہے۔ پس 'سُنّت' کا لفظ 'اسم مفعول' کے معنی میں ہے جیسا کہ 'غرفة' کا لفظ ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ سُنّت کا لفظ 'سننتُ النصل' سے ہے' یعنی میں نے چاقو کے پھل کو تیز کیا۔ یعنی جب میں نے اس کو کسی سان پر تیز کیا ہو۔ اور 'سُنّت' سے مراد اچھا طریقہ ہوگا کہ جس کا اہتمام کیا جائے' جیسا کہ چاقو کے پھل کی پرواہ وغیرہ کی جاتی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ 'سُنّت' کا لفظ 'سنّ الابل' سے ماخوذ ہے' یعنی اونٹوں کی اچھی طرح نگہبانی کرنا اور 'سُنّت' کا معنی یہ ہوگا کہ صاحب سُنّت کی حیثیت اپنی قوم کی نگرانی میں ایسی ہی ہوگی جیسا کہ ایک چرواہا اپنے اونٹوں کی نگہبانی کرتا ہے۔ اور جس کام کو اللہ کے رسول ﷺ نے جاری کیا اس کو 'سُنّت' کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ آپؐ نے اس کام کی اچھی طرح نگہبانی کی اور اس کو دوام بخشا''۔

سوال: اہل سُنّت کا لفظ جب آپ استعمال کرتے ہیں تو اس سے آپ کی مراد کون سی جماعت ہوتی ہے؟

جواب: ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فقہی مباحث میں جب اہل سُنّت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس

سے مراد صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ، اہل الحدیث اور اہل الظواہر ہوتے ہیں اور ہمارے اس مضمون میں بھی اہل سُنّت سے مراد یہی گروہ ہیں۔

سوال: اہل سُنّت کے ہاں 'سُنّت' کے لفظ کا اصطلاحی معنی کیا ہے؟

جواب: جمیع اہل سُنّت کے نزدیک 'سُنّت' سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال، افعال و تقریرات ہیں۔ معروف حنفی فقہاء علامہ کمال الدین ابن الہمامؒ (متوفی ۸۶۱ھ) اور علامہ ابن امیر الحاجؒ (متوفی ۸۷۱ھ) لکھتے ہیں:

(السنة) و هی لغة (الطريقة المعتادة) محمودة كان أو لا...(و فی الأصول قوله عليه السلام و فعله و تقريره) مما ليس من الأمور الطبيعية[۲]

''سُنّت' کا لغوی معنی ایسا طریقہ ہے جس کے لوگ عادی ہوں چاہے وہ اچھا ہو یا برا... اور اصولِ فقہ میں 'سُنّت' سے مراد رسول اللہ ﷺ کا وہ قول، فعل اور تقریر ہے جو طبعی امور کے علاوہ ہیں''۔

شافعی فقیہہ امام زرکشیؒ (متوفی ۷۹۴ھ) فرماتے ہیں:

المراد هنا ما صدر من الرسول ﷺ من الأقوال والأفعال والتقرير و الهم وهذا الأخير لم يذكره الأصوليون[۳]

''یہاں یعنی اصولِ فقہ میں سُنّت سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال، تقریرات اور کسی کام کو کرنے کا ارادہ ہیں۔ اس آخری قسم کو 'سُنّت' کی تعریف میں عموماً اصولیین نے بیان نہیں کیا ہے''۔

مالکی فقیہہ امام شاطبیؒ (متوفی ۷۹۵ھ) لکھتے ہیں:

واذا جمع ما تقدم تحصل منه فی الاطلاق أربعة أوجه قوله عليه الصلاة والسلام و فعله و تقريره وكل ذلک اما متلقى بالوحی أو بالاجتهاد بناء على صحة الاجتهاد فی حقه وهذه الثلاثة والرابع ما جاء عن الصحابة أو الخلفاء[٤]

''سُنّت کے بارے میں ہم نے جو پیچھے بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ 'سُنّت' سے مطلق طور پر مراد رسول اللہ ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے اور یہ تینوں یا تو وحی کی بنیاد پر ہوں گے یا آپؐ کا اجتہاد ہوگا، بشرطیکہ آپ کے لیے اجتہاد کرنے کا قول صحیح ہو۔ یہ 'سُنّت' کی تین صورتیں ہیں اور اس کی چوتھی صورت صحابہؓ اور خلفائے راشدین کی سُنّت ہے''۔

حنبلی فقیہہ و مجتہد امام ابن تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ) فرماتے ہیں:

الحديث النبوی هو عند الاطلاق ينصرف على ماحدث به عنه بعد النبوة من قوله و فعله واقراره فان سُنّته ثبتت من هذه الوجوه الثلاثة[٥]

''حدیث نبویؐ سے مراد آپؐ کا وہ قول، فعل اور تقریر ہے جو کہ آپؐ سے نبوت کے بعد صادر ہوا ہو۔ پس آپؐ کی 'سُنّت' ان تین صورتوں سے ثابت ہوتی ہے''۔

سلفی فقیہہ ومجتہد امام شوکانیؒ (متوفی ۱۲۵۰ھ) ☆ لکھتے ہیں:

واما معناها شرعا أی فی اصطلاح أهل الشرع فهی قول النبی ﷺ وفعله وتقریره(۶)

''اور سُنّت کا شرعی معنی یعنی اہل شرع کی اصطلاح میں 'سُنّت' نبی مکرم ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو کہتے ہیں''۔

سوال: بعض علماء نے سُنّت کے اصطلاحی مفہوم سے مراد 'سُنّت مؤکدہ وغیر مؤکدہ' بھی لیا ہے۔ لہٰذا آپ کی اس بات کا کیا مطلب ہے کہ ''سُنّت کا اصطلاحی مفہوم رسول اللہ ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے اور سُنّت کے اس مفہوم پر امت کا اتفاق بھی ہے''؟

جواب: ہم یہ وضاحت پہلے کر چکے ہیں کہ فقہ کی کتابوں میں 'سُنّت' کا لفظ 'سُنّت مؤکدہ' 'سُنّت غیر مؤکدہ' اور 'سُنّت زائدہ' کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح عقائد کی کتب میں کسی عقیدے کو 'سُنّت' کہنے سے عموماً مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ عقیدہ بدعت نہیں ہے۔ لیکن اہل سُنّت جب 'سُنّت' کے لفظ کو مصدرِ شریعت اور قانونی ماخذ کے طور پر بیان کرتے ہیں تو ان سب کی مراد ایک ہی مفہوم ہوتا ہے اور وہ آپ ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ مصادرِ شریعت و مآخذ قانون اسلامی کی بحث فقہاء وعلماء اصولِ فقہ کی کتابوں میں کرتے ہیں نہ کہ فقہ یا عقائد پر مبنی تصانیف میں۔ لہٰذا اہل سُنّت میں جب بھی کوئی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری یا سلفی عالم دین 'سُنّت' کے لفظ کو مصدر شریعت کے معنی میں استعمال کرے گا تو اس کی مراد فی الواقع آپ ﷺ کا قول، فعل اور تقریر ہی ہوگا۔

سوال: بعض عوام الناس کے ذہنوں میں یہ بات بھی بیٹھی ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سُنّت سے مراد آپؐ کی عملی زندگی ہے۔ یہ بات کس حد تک درست ہے؟

جواب: یہ انکارِ حدیث کے گمراہ کن تصورات میں سے ایک تصور ہے جو مولانا اصلاحی مرحوم کی بعض عبارتوں سے مترشح ہوتا ہے۔ بعد ازاں جناب غامدی صاحب نے اپنے استاد اصلاحی صاحب کی عبارتوں پر استوار 'سُنّت' کا ایک بالکل جدید و مذموم تصور متعارف کروایا۔ ہمارے ہاں بعض مذہبی حلقوں میں بھی یہ تصور اصلاحی صاحب سے استفادے کے نتیجے میں نفوذ پذیر ہوا ہے۔ غامدی صاحب کے اس تصور کے مطابق جب 'سُنّت' کے لفظ کو بطور مصدر شریعت استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد صرف رسالت

☆ محققین کے نزدیک پہلے یہ زیدی تھے، بعد میں انہوں نے زیدیہ (اہل تشیع کا ایک معتدل فرقہ) کے عقائد و فروعات سے رجوع کر لیا تھا۔ شروع میں یہ زیدی تھے جبکہ بالآخر یہ سلفی المسلک کے پرجوش داعی ومبلغ تھے۔ ان کی کتاب ''**التحف بمذهب السلف**'' اور ''**کشف الشبهات عن المشتبهات**'' اس بات پر دلیل ہیں کہ وہ عقیدے میں سلفی تھے۔ اسی طرح ان کی کتاب ''**القول المفید فی ادلة الاجتهاد والتقلید**'' اور ''**السیل الجرار**'' یہ واضح کرتی ہے کہ وہ فقہی آراء کے اختیار میں امام زید بن علیؒ کے مذہب کو چھوڑ کر اہل الحدیث کے منہج کو اختیار کر چکے تھے۔

مآب ﷺ کی عملی زندگی ہوتی ہے اور آپؐ کے اقوال وتقریرات اور اخبار احاد کو، حالانکہ ان کا تعلق عموماً عملی زندگی سے نہیں ہوتا، غامدی صاحب مستقل بالذات مصدر شریعت یا ماخذ قانون نہیں سمجھتے۔

دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ اس مضمون میں ہمارا موضوعِ بحث سُنّت کی اتباع ہے اور قرآن و حدیث میں جب اللہ کے رسول ﷺ کی سُنّت یا آپؐ کی بذاتہ اتباع کا حکم دیا جاتا ہے تو کون صاحب عقل یہ کہنے کی جرأت کرے گا کہ آیت قرآنی ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ میں 'فَاتَّبِعُوْنِیْ' سے مراد صرف آپ ﷺ کی عملی زندگی میں آپ کی اتباع ہے نہ کہ آپؐ کے اقوال وتقریرات میں؟ واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی عملی زندگی آپؐ کی سُنّت کا ایک جزو ہے نہ کہ کل سُنّت ہے۔ کل سُنّت سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات ہیں۔ ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ اتباع سے مراد صرف عمل کی پیروی نہیں ہوتی بلکہ قول کی پیروی بھی اس میں داخل ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ﴿فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ﴾ (ھود: ۹۷) میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرعون کے امر وحکم یعنی قول کی پیروی کو اتباع قرار دیا ہے۔

سوال: آپ نے اہل سُنّت کے حوالے سے یہ موقف بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر ہر قول، فعل یا تقریر سُنّت نہیں ہے بلکہ آپؐ کے بعض اقوال، افعال یا تقریرات سُنّت ہیں۔ بظاہر یہ موقف بھی تو انکارِ سُنّت یا انکارِ حدیث ہی کی ایک قسم نہیں بن جاتا؟

جواب: آپ ہماری بات کو ایک دوسرے زاویے سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اہل سُنّت کا کہنا یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ہر ہر قول، فعل یا تقریر سُنّت اور قابل اتباع ہے بشرطیکہ اس کا تعلق شریعت سے ہو۔ اس کی مزید وضاحت اس طرح سے ہے کہ آپؐ اصلاً تو اللہ کے رسول و نبی تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپؐ کی ایک بشری زندگی بھی تھی جس کے تقاضوں کے تحت آپ بعض اوقات کوئی دنیاوی بات بھی فرما لیتے تھے یا کوئی ایسا کام بھی کر لیتے تھے جس کا تعلق ان جائز امور سے ہوتا تھا جو براہِ راست دین کا موضوع نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ﷺ خلوت میں اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے کیا باتیں فرمایا کرتے تھے، کسی بھی صحابیؓ نے نہ تو ان کو نقل کیا ہے اور نہ ہی ان کے جاننے کی کوشش کی ہے۔ آپ ذرا غور کریں کہ اگر کوئی شخص اتباع سُنّت کے جذبے میں غلو کرتے ہوئے آپؐ کے زمانے میں یہ حرکت کر گزرتا کہ آپؐ کے حجرے کے باہر کھڑے ہو کر آپؐ کی وہ باتیں سُنتا جو آپ ﷺ خلوت میں اپنی ازواج سے فرمایا کرتے تھے تاکہ وہ شخص بھی خلوت میں اپنی بیوی سے وہی باتیں کرے اور سُنّت کا اجر پائے، تو اللہ کے رسول ﷺ، صحابہؓ یا آج کے ایک غیرت مند مسلمان کی اس ''قبیح سُنّت'' شخص کے بارے میں کیا رائے ہوگی؟ اس کو ایک اور مثال سے یوں سمجھیں کہ آپ ﷺ نے روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لیا تو اب ایک نوجوان رمضان کے مہینے میں روزانہ اپنی بیوی کا پچاس دفعہ بوسہ اس لیے لے کہ ہر بوسے پر سُنّت کا اجر و ثواب ملے گا تو آپ کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہوگی، جبکہ اس کا اپنی بیوی کے ساتھ ملوث ہونے

کا قوی اندیشہ بھی موجود ہو؟ اس ضمن میں ایک اور مثال یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ضرورت کے تحت گدھے کی سواری کی' اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ایک جائز امر ہے۔ اب ایک مدرسہ یا دارالعلوم والے ایک گدھا خرید کر اپنے پاس رکھ لیں اور روزانہ صبح تمام کلاسز کے طالب علم اور اساتذہ اس گدھے پر باری باری سوار ہوں اور اس عمل کو باعث اجر و ثواب سمجھتے ہوئے اس پر پابندی کریں تو ان ''متبعین سُنّت'' کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی؟ اس کو ایک مزید مثال سے سمجھیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کسی وجہ سے یا بغیر کسی عذر کے اپنی نواسی امامہ بنت زینب کو گود میں اٹھا کر جماعت کروائی۔ اب کسی مسجد میں تمام نمازی اور امام صاحب اپنے شیر خوار بچوں کو روزانہ مسجد میں لے آئیں اور گود میں اٹھا کر نماز پڑھیں تو آپ کی ان نمازیوں کے بارے میں کیا رائے ہوگی؟ اللہ کے رسول ﷺ کا خلوت میں اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے پیار و محبت کی باتیں کرنا' روزے کی حالت میں بوسہ دینا' اتفاقاً گدھے کی سواری کرنا' نماز کی حالت میں اپنی نواسی کو کندھوں پر بٹھانا' یہ سب کام اس امر کی طرف متوجہ کرنے کے لیے تھے کہ یہ جائز و مباح امور ہیں۔ اگر تو یہ کہا جائے کہ آپؐ نے یہ کام اس لیے کیے تاکہ اُمت کو معلوم ہو کہ یہ جائز امور ہیں اور اس اعتبار سے یہ دین کا موضوع ہیں تو ہمیں اس نقطہ نظر سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن اِس مضمون میں ہمارا موضوعِ بحث 'اتباعِ سُنّت' تھا۔ جب سُنّت کی اتباع کی بحث کی جاتی ہے تو آپؐ کے بہت سے ایسے اقوال و اعمال بھی ہوتے ہیں جن میں اللہ کی طرف سے آپ ﷺ کی اتباع کا مطالبہ اُمت سے نہیں ہوا ہوتا' اسی کو اہل سُنّت آپؐ کی بشری زندگی کا نام دیتے ہیں۔ یعنی ایک آپؐ کی شرعی زندگی ہے اور ایک بشری زندگی ہے۔ آپؐ کی شرعی زندگی کا ہر ہر قول' فعل اور تقریر شریعت و قابل اتباع ہے جبکہ آپؐ کی بشری زندگی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس میں اُمت سے آپؐ کی اتباع کا مطالبہ نہیں ہے۔

سوال: یہ کیسے معلوم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کا فلاں قول یا فعل آپؐ کی بشری زندگی سے متعلق ہے یا شرعی زندگی سے؟

جواب: یہ بہت ہی اہم سوال ہے اور اسی سوال کا جواب ہم نے اس مضمون کی پچھلی دو اقساط میں تفصیلاً دیا ہے۔ فقہائے اہل سُنّت نے کچھ ایسے اصول بیان کر دیے ہیں جن کی روشنی میں آپ ﷺ کی شرعی و بشری زندگی سے متعلق اقوال و افعال میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک اصول یہ ہے کہ اتفاقی امور کا تعلق آپؐ کی بشری زندگی سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا گدھے کی سواری کرنا یا اونٹ پر طواف کرنا ایک اتفاقی امر تھا۔

سوال: کیا فقہاء نے کوئی ایسی فہرست مرتب کی ہے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ﷺ کی فلاں سنن آپؐ کی بشری زندگی سے متعلق ہیں اور فلاں کا تعلق شریعت سے ہے؟

جواب: فقہاء یا علماء نے اس قسم کی کوئی فہرست مرتب نہیں کی ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کوئی ایسی فہرست

بھی آج تک فقہاء یا علماء نے مرتب نہیں کی ہے جس میں تمام سنن کا احاطہ کر لیا گیا ہو' بلکہ علماء اور محدثین نے ایسی کتب احادیث کو مرتب و مدوّن کیا ہے جن میں ان سنن کا بیان تھا۔

اس فہرست کو مرتب نہ کرنے میں کیا حکمت کارفرما ہے' اب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بعض اقوال و افعال کے بارے میں تو فقہاء کا اجماع ہے کہ ان کا تعلق آپؐ کی شرعی زندگی سے ہے' جیسا کہ آپ ﷺ کا دن میں پانچ نمازیں پڑھنا۔ اور آپؐ کے بعض اقوال و افعال کے بارے میں فقہاء کا اتفاق یہ ہے کہ ان کا تعلق آپؐ کی بشری زندگی سے ہے' جیسا کہ آپ ﷺ کا اونٹ پر طواف کرنا۔ طواف کرنا تو ایک شرعی حکم ہے لیکن اونٹ پر سوار ہو کر طواف کرنا ایک بشری تقاضے کے تحت تھا۔ لہٰذا افضل یہی ہے کہ پیدل طواف کیا جائے چاہے اونٹ پر طواف کی سہولت موجود بھی کیوں نہ ہو۔ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں اس بات پر اُمت کا اجماع نقل کیا ہے کہ پیدل طواف افضل ہے۔ یعنی آپ ﷺ کا اونٹ پر طواف کرنا ایک شرعی سُنّت نہ تھا بلکہ ایک بشری تقاضا تھا جس میں آپؐ کی اتباع کا مطالبہ اُمت سے نہیں ہے۔ اور اسی بات کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی ایک روایت میں واضح کیا ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ جبکہ آپ ﷺ کے بعض اقوال و افعال ایسے ہیں جن کے بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہو جاتا ہے کہ ان کا تعلق بشری زندگی سے ہے یا شرعی زندگی سے۔ جیسا کہ آپؐ کے لباس مثلاً عمامے کے بارے میں برصغیر پاک و ہند کے حنفی علماء کا موقف یہ ہے کہ عمامہ پہننا آپ ﷺ کی شرعی زندگی سے متعلق تھا لہٰذا عمامہ باندھنا ایک شرعی سُنّت ہے' جبکہ سعودی عرب اور بعض دوسرے عرب ممالک کے حنبلی' شافعی' مالکی اور سلفی علماء کی اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ آپ ﷺ کا عمامہ باندھنا عرب کے رسوم و رواج کے مطابق تھا اور یہ کوئی شرعی حکم نہیں ہے' لہٰذا یہ سُنّتِ شرعیہ بھی نہیں ہے۔ ہمارا موقف بھی یہی ہے' جس پر ہم اِن شاء اللہ ایک علیحدہ مضمون میں بالتفصیل گفتگو کریں گے۔ علماء کا یہ اختلاف دلائل و قرائن کی بنیاد پر ہوتا ہے اور جس طرف قوی استدلال موجود ہوگا وہ موقف راجح ہوگا۔ پس اس مسئلے میں علماء کا یہ اختلاف ایک ایسا امر ہے جو سنن کی اس قسم کی فہرستیں مرتب کرنے میں مانع ہے۔

آج تک مختلف علماء و مفسرین نے قرآن کی آیاتِ احکام سے شرعی احکام کی جو فہرستیں مرتب کی ہیں ان کی تعداد میں بھی اختلاف ہے' کیونکہ منہجِ استنباطِ احکام' اصولِ فقہ' طریقۂ استدلال اور فہم و فراست کا فرق ہوتا ہے۔ ایک فقیہہ کو بظاہر ایک آیت سے کوئی حکم اخذ ہوتا نظر نہیں آتا لیکن دوسرا فقیہہ اسی آیت سے دس قسم کے احکام مستنبط کر لیتا ہے۔ پس احادیث سے رسول اللہ ﷺ کی سنن کی فہرست مرتب کرنے میں بھی اس قسم کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سنن کے مصادر محدثین نے کتب احادیث کی صورت میں مرتب کر دیے ہیں جن سے علماء قیامت تک انسانی زندگی کے جمیع گوشوں کے لیے رہنمائی فراہم کرتے رہیں گے۔

سوال: علماء تو اپنے اصول و ضوابط کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی شرعی و بشری زندگی میں فرق کر لیں گے

لیکن ایک عامی کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ شرعی سُنّت ہے یا بشری زندگی ہے؟

جواب: ہم یہ بات پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اصل زندگی شرعی زندگی ہے اور آپؐ کی یہ زندگی آپؐ کی بشری زندگی پر حاوی ہے۔ اصل الاصول یہی ہے کہ آپؐ کے ہر قول، فعل یا تقریر کو شرعی زندگی سے متعلق ہی سمجھا جائے اِلّا یہ کہ کسی قول یا فعل کے بارے میں کوئی قرینہ یا دلیل پائی جائے کہ اس قول یا فعل کا تعلق بشری زندگی سے ہے۔ پس آپؐ کے اکثر و بیشتر اقوال و افعال شرعی زندگی سے متعلق ہیں جن کی اتباع مطلوب ہے۔ ہاں بعض اقوال و افعال ایسے ہیں جو بشری زندگی میں داخل ہیں لیکن یہ بشری زندگی، آپؐ کی شرعی زندگی کے بالمقابل نسبتاً کم ہے۔ پس ایک عامی جب آپؐ کے کسی قول، فعل یا تقریر کی پیروی کرتا ہے تو آپؐ کی شرعی زندگی ہی کی پیروی کر رہا ہوتا ہے اور آپؐ کے جن اقوال و افعال کا تعلق بشری زندگی سے ہو تو عموماً معاشرے میں علماء کی ان کے بارے میں بحث جاری رہتی ہے اور ایک عامی بھی اگر دین سے تھوڑا بہت تعلق رکھتا ہو تو اسے عموماً معلوم ہوتا ہی ہے کہ اس مسئلے میں علماء کی یہ رائے ہے یا فلاں اختلاف ہے۔ جیسا کہ پاکستان میں نماز کی حالت میں پہلی و تیسری رکعت میں جلسۂ استراحت کے بارے میں حنفی علماء کا کہنا یہ ہے کہ یہ بشری زندگی سے متعلق تھا، یعنی آپ ﷺ نے بڑھاپے کی وجہ سے جلسۂ استراحت کیا ہے جبکہ اہل حدیث علماء اسے سُنّتِ شرعیہ مانتے ہیں۔ اسی طرح اکثر سلفی علماء کے ہاں عمامہ باندھنا سُنّت نہیں ہے جبکہ حنفی علماء اس کو سُنّت قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص سُنّت کی اتباع کرنا چاہتا ہے تو وہ آپؐ کے اکثر و بیشتر اقوال و افعال کی پیروی کرے گا اور آپؐ کے ان اقوال و افعال کے بارے میں بھی علماء کے اختلاف سے کسی قدر واقف ہوگا جن میں بشری یا شرعی زندگی کا تنازع سلف صالحین ہی سے نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

پس ایک عامی کو ہم یہ نصیحت ضرور کریں گے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ایسے اقوال و افعال کی پیروی و اتباع پر زور نہ دے جن کے بارے میں اُمت کا اتفاق ہے کہ ان میں آپؐ کی اتباع مطلوب نہیں ہے یا ان کے بارے میں امت کا اختلاف ہے کہ وہ اقوال و افعال بشری معاملات سے متعلق ہیں یا شرعی حیثیت سے وارد ہوئے ہیں، اور کوئی ایسے صریح قرائن یا دلائل بھی موجود نہ ہوں جو ان اقوال یا افعال کے شرعی ہونے میں نص قطعی یا ظن غالب کا درجہ رکھتے ہوں۔

سوال: بعض لوگ آپ کے بارے میں یہ بات مشہور کر رہے ہیں کہ آپ نے اپنے سابقہ مضمون میں یہ لکھا ہے کہ عمامہ پہننا بدعت ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: ہم ایسا بہتان لگانے والوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ ہمارا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ جو عمامہ پہننے کو بدعت کہے وہ خود بدعتی ہے۔ صحیح احادیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے عمامہ پہنا تو آپؐ معاذ اللہ! کوئی بدعت کیسے کر سکتے ہیں؟ درحقیقت ہمارے بعض ناراض دوستوں نے جب ہمارا موقف

اپنے تعصب کی عینک سے دیکھنا شروع کیا تو انہوں نے ایسی چیزیں کھینچ تان کر ہمارے مضمون سے نکالنے کی کوشش کی جو ہمارا مقصود نہ تھیں۔ آپ ہماری بات کو غور سے سمجھیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے عمامہ باندھا' کیونکہ عمامہ آپؐ کے زمانے کا ایک معروف و مروّج لباس تھا' لیکن آپؐ نے عمامہ تقرب الی اللہ یا عبادت یا ثواب کی نیت سے نہیں باندھا۔ لہٰذا عمامہ باندھنے کا تعلق آپؐ کی بشری زندگی سے ہے۔ پس عمامہ باندھنا ایک مباح امر ہے۔ اگر کوئی شخص عمامہ باندھنا چاہتا ہے تو ضرور باندھے۔ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے! لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ آپؐ نے عمامہ تقرب الی اللہ یا عبادت کی نیت سے باندھا تھا تو ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہمارے نزدیک عمامہ باندھنا اور نہ باندھنا برابر ہے۔ نہ عمامہ باندھنے پر کوئی اجر و ثواب ہے اور نہ ہی عمامہ نہ باندھنے پر۔ عمامہ باندھنا اور نہ باندھنا ایک مباح امر ہے اور مباح کی تعریف علمائے اہل سُنّت کے ہاں یہی ہے کہ جس کے کرنے یا نہ کرنے پر کوئی اجر و ثواب نہ ہو۔ عمامے کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ آپؐ نے تہبند باندھا۔ لہٰذا تہبند باندھنا اور نہ باندھنا اور عمامہ باندھنا یا نہ باندھنا یہ کوئی دین کا موضوع نہیں ہے' بلکہ اس کا تعلق آپ ﷺ کی بشری زندگی سے ہے جس میں آپؐ کی اتباع کا امت سے کوئی تقاضا نہیں ہے۔

سوال: آپ نے اپنے مضمون میں اہل بدعت کا لفظ استعمال کیا تھا تو وہ آپ نے کس کو کہا تھا؟ آپ اپنی مندرجہ بالا بات کو ذرا مزید واضح کریں۔

جواب: یہ ایک انتہائی باریک نکتہ ہے جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اور امام ابن تیمیہؒ نے بیان کیا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے گدھے کی سواری کی۔ ظاہری بات ہے اللہ کے رسول ﷺ نے یہ کام اتفاقاً یا ضرورتاً کیا تھا۔ کوئی بھی صاحبِ عقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ ﷺ تقرب الی اللہ یا عبادت یا ثواب کی نیت سے گدھے پر سوار ہوئے۔ یعنی ایسا معاملہ نہیں تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو یہ وحی ہوئی ہو کہ گدھے کی سواری اللہ کے ہاں باعث اجر و ثواب ہے لہٰذا آپؐ نے اجر و ثواب کی نیت سے گدھے کی سواری کی ہو' بلکہ آپؐ کو سواری کی ضرورت تھی' لہٰذا جو سواری میسر آئی آپؐ اس پر سوار ہوگئے۔ پس گدھے پر سواری ایک دینی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق آپؐ کی بشری زندگی سے ہے۔ چنانچہ گدھے پر سواری ایک جائز امر ہے' لیکن اس فعل میں امت سے آپؐ کی اتباع کا مطالبہ نہیں ہے۔ اس واقعے کا اگر ہم تجزیہ کریں تو درج ذیل ممکنہ موقف ہمارے سامنے آتے ہیں:

(۱) گدھے کی سواری ایک مباح و جائز امر ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے گدھے کی سواری ثواب کی نیت سے نہیں کی' لہٰذا ایک مسلمان کو بھی جب گدھے کی سواری کی ضرورت پیش آئے تو وہ بھی اسی نیت کے ساتھ اس کی سواری کرے جس نیت کے ساتھ آپؐ نے اس کی سواری کی تھی۔ یعنی آپؐ نے اگر ایک کام کو مباح (بغیر اجر و ثواب کی نیت کے) سمجھ کر کیا تو آپؐ کی اتباع یہی ہے کہ اُمت بھی اس کو مباح سمجھ

کر کرے۔ اگر آپؐ نے ایک کام مباح سمجھ کر کیا اور کوئی امتی اس کام کو مستحب (باعث اجر وثواب) سمجھ کر کرے تو ایسا امتی آپؐ کا متبع نہیں ہے۔ یہ موقف علمائے اہل سُنّت کا ہے۔

(۲) گدھے کی سواری ایک سُنّتِ شرعیہ ہے۔ پس گدھے پر سوار ہونا باعث عبادت واجر وثواب ہے اور آپؐ کی اس اتباع میں شامل ہے جس کا حکم ہمیں ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ میں دیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک یہ موقف ایک بدعتی موقف ہے۔

میں پھر یہ کہوں گا کہ میں یہ نہیں کہتا بلکہ حضرت عمرؓ اور امام ابن تیمیہؒ نے اس موقف کو بدعت کہا ہے اور ان ہی بزرگوں کے حوالے ہم نے اپنے اصل مضمون میں نقل کیے تھے۔ میں تو دین کا ایک ادنی سا طالب علم ہوں۔ میری کیا مجال کہ اتنی بڑی بات کہوں! اگر کسی شخص کو اعتراض ہو تو وہ ان دلائل کا جواب دے جو کہ حضرت عمرؓ اور امام ابن تیمیہؒ نے اس مسئلے میں بیان کیے ہیں۔

سوال: ہمارے ہاں حنفی فقہ کے پیروکاروں کی اکثریت ہے۔ اگر آپ اس مسئلے کی وضاحت میں کچھ حنفی فقہاء کے اقوال پیش کر دیں تو شاید ہمیں اطمینان ہو جائے۔

جواب: متقدمین حنفی فقہاء نے اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے جو ان کی اصول کی کتابوں میں موجود ہے۔ امام ابوبکر جصاص الحنفیؒ (متوفی ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں:

فمعلوم أنه ان كان فعله على وجه الاباحة والندب ثم فعلناه نحن على وجه الوجوب لم نكن متبعين له لأن شرط الاتباع ايقاعه على الوجه الذى أوقعه عليه و متى خالفناه فى هذا الوجه خرجنا من حد الاتباع. ألا ترى أن من فعل فعلا ففعل غيره مثله على وجه المعارضة له و المضاهاة لفعله قاصدا المعارضة و مباراته لم يكن متبعا له و ان كان قد أوقع فعلا مثل فعله فى الظاهر(۷)

''یہ بات معلوم شدہ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ نے ایک کام کو مباح یا مستحب سمجھ کر کیا ہے اور ہم اسے واجب سمجھ کر کریں تو آپؐ کے متبع شمار نہ ہوں گے' کیونکہ اتباع کی یہ لازمی شرط ہے کہ کسی کام کو اسی نیت وارادے سے کیا جائے جس نیت وارادے سے آپؐ نے اس کام کو کیا ہے۔ اور اگر (کسی سُنّت پر عمل کرتے ہوئے) ہم نیت وارادے میں آپؐ کی مخالفت کریں گے تو ہم اتباع کی تعریف سے نکل جائیں گے۔ کیا آپ غور نہیں کرتے کہ ایک شخص ایک کام کرتا ہے اور ایک دوسرا شخص بظاہر ویسا ہی کام کرتا ہے لیکن اس کا مقصود پہلے شخص کی مخالفت اور اس سے علیحدگی ہے' تو بظاہر دونوں کے کام میں کتنی ہی مشابہت کیوں نہ ہو دوسرا شخص پہلے کا متبع نہ ہوگا''۔

اس سے معلوم ہوا کہ فقہائے احناف کے ہاں اگر کوئی شخص کسی ایسے فعل کو جو رسول اللہ ﷺ کے حق میں مباح ہو' مستحب سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہو تو وہ امتی آپؐ کا متبع نہیں ہے۔ پس ہم بھی یہی بات کرتے ہیں

کہ آپؐ کے جو اقوال و افعال باتفاقِ اُمت مباح درجے کے ہیں ان کو مستحب یا مندوب نہ بنالیا جائے۔

سوال: مباح و مندوب میں اہل سُنّت کے نزدیک کیا فرق ہے؟ حنفی فقہاء کے حوالے سے بیان کریں!

جواب: اہل سُنّت کے نزدیک مباح سے مراد وہ امور ہیں جن کا کرنا اور نہ کرنا برابر ہو اور ان کے کرنے اور نہ کرنے میں کوئی اجر و ثواب نہ ہو۔ جبکہ مندوب سے مراد وہ افعال ہیں جن کے کرنے پر اجر و ثواب کا وعدہ ہو لیکن ان کا کرنا لازم نہ ہو۔ علامہ علاؤالدین بخاریؒ (متوفی ۷۳۰ھ) فرماتے ہیں:

''ہمارے فقہاء کی بعض اصول کی کتابوں میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے کہ مکلّف سے صادر ہونے والے فعل میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو اس فعل کی ادائیگی کا پہلو راجح ہوگا یا ترک کا' یا ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہوگا۔ پہلی قسم میں (جبکہ کسی مکلّف کے فعل کی ادائیگی کا پہلو راجح ہو) ایک صورت تو یہ بنے گی کہ اس کے منکر کی تکفیر کی جائے اور اس کو گمراہ ٹھہرایا جائے اور یہ فرض ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے منکر کی تکفیر نہ ہو لیکن اس کو چھوڑنے پر عذاب کی وعید ہو تو یہ واجب ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اس کے چھوڑنے پر سزا بھی نہ ہو۔ اور اس کی پھر دو صورتیں ہیں۔ یا تو آپؐ نے اس پر مواظبت اختیار کی ہو تو یہ سُنّت مشہورہ ہے اور اگر آپؐ نے اس پر مواظبت اختیار نہیں کی تو یہ نفل یا مندوب یا تطوع ہے۔ دوسری قسم (جس میں مکلّف کے فعل میں ترک کا پہلو راجح ہو) میں پہلی صورت تو یہ ہے کہ اس کے کرنے میں عذاب ہو اور یہ حرام ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے کرنے پر عذاب نہ ہو اور یہ مکروہ ہے۔ تیسری قسم مباح ہے جس کی ادائیگی میں نہ تو کوئی ثواب ہے اور نہ ہی اس کے چھوڑنے پر کوئی عذاب ہے''۔(۸)

سوال: آپ کی باتوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں عمامہ وغیرہ نہیں باندھنا چاہیے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: میں نے یہ کب کہا ہے کہ ہمیں عمامہ نہیں باندھنا چاہیے؟ میں نے تو یہ کہا ہے کہ عمامہ باندھنے کو دین کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ علاوہ ازیں ہم نے پہلے بھی یہ لکھا تھا اور اب بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ مذہبی حلقوں' دینی تحریکوں اور علماء کو اپنے سر کو ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔ چاہے عمامہ باندھیں یا ٹوپی استعمال کریں۔

سوال: آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ عمامہ باندھنا دین کا مسئلہ نہیں ہے اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ مذہبی لوگوں کو عمامہ باندھنا چاہیے۔ یہ تضاد بیانی نہیں ہے؟

جواب: یہ بالکل بھی تضاد نہیں ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ دینی تحریکوں کے کارکنان کو اپنا سر ڈھانپ کر رکھنا چاہیے تو وہ اس وجہ سے ہے کہ ہمارے مسلمان معاشروں کا یہ عرف و رواج ہے کہ علماء اپنے سر کو ڈھانپ کر رکھتے ہیں۔ اس کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھیں کہ اگر ہم کسی شخص سے یہ سوال کریں کہ کپڑے استری کر کے پہننے چاہئیں یا بغیر استری کے؟ تو اس کا جواب ہوگا کہ استری کر کے پہننے چاہئیں۔ لیکن اگر اسی شخص سے یہ بھی سوال کیا جائے کہ کیا استری شدہ کپڑے پہننا ایک دینی مسئلہ' یعنی باعث اجر و ثواب ہے؟ تو اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ لہٰذا کسی کام کے کرنے کا مطلب یہ بالکل بھی نہیں ہے کہ ہم اسے صرف

اسی صورت کرتے ہیں جبکہ وہ ہمارے دین ہی کا مطالبہ ہو۔ یہ مسئلہ اصولی طور پر عرف کی بحث کا ہے۔

سوال: متقدمین حنفی فقہاء نے رسول اللہ ﷺ کے افعال کی جو قسمیں بیان کی ہیں ان پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

جواب: احنافؒ نے اللہ کے رسول ﷺ کے افعال کی چھ قسمیں بنائی ہیں:

پہلی قسم: فقہائے احناف کے نزدیک اللہ کے رسول ﷺ کے افعال کی ایک قسم وہ ہے جو کہ 'غیر ارادی افعال' پر مشتمل ہے۔ غیر ارادی افعال کئی قسم کے ہوتے ہیں جن میں ایک کو فقہائے احناف نے 'زلۃ' یعنی بھول چوک کا نام دیا ہے۔ 'زلۃ' کے علاوہ غیر ارادی افعال کی ایک دوسری قسم کے طور پر فقہائے احناف نے آپؐ کے ان افعال کو بھی بیان کیا ہے جو آپؐ سے نیند یا بے ہوشی کی حالت میں سرزد ہوئے ہوں۔ فقہائے احناف کے نزدیک اس قسم کے افعال میں اللہ کے رسول ﷺ کی اقتداء کسی بھی امتی کے لیے جائز نہیں ہے۔ فخر الاسلام امام بزدویؒ (متوفی ۴۸۳ھ) لکھتے ہیں:

''اللہ کے رسول ﷺ کے افعال کی اقسام میں مباح، مستحب، واجب اور فرض شامل ہیں۔ آپؐ کے افعال کی ایک اور قسم 'زلۃ' بھی ہے۔ 'زلۃ' کا تعلق اس باب (یعنی اتباع) سے نہیں ہے، کیونکہ 'زلۃ' میں کسی بھی نبی ورسول کی اقتداء و پیروی درست نہیں ہے۔ (قرآن وسُنّت میں) اس قسم کے افعال کے تذکرہ کے ساتھ ہی خود فاعل یا اللہ کی طرف سے ایک بیان متصل بعد ہوتا ہے (جو کہ اس کے قابل اقتداء نہ ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے)۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور حضرت آدمؑ نے نافرمانی کی''۔ ایک اور جگہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ایک قبطی کے قتل ہونے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''حضرت موسیٰؑ نے کہا یہ تو شیطان کا کام ہے''۔ 'زلۃ' سے مراد وہ فعل ہے جس کے کرنے کا فاعل نے ارادہ نہ کیا ہو لیکن فاعل نے ایک دوسرے مباح فعل کا قصد کیا ہو اور اس مباح فعل کے ارتکاب نے فاعل کو 'زلۃ' تک پہنچا دیا ہو''۔ پس وہ شخص ایک مقصود بعینہٖ حرام فعل (یعنی ایسا حرام فعل کہ اس کے ارتکاب کا قصد کیا گیا ہو) میں مشغول ہونے کی وجہ سے پھسل گیا''۔ (۹)

شمس الائمہ امام سرخسیؒ (متوفی ۴۸۳ھ) فرماتے ہیں:

''جان لو کہ اللہ کے رسول ﷺ کے وہ افعال جو کہ قصد وارادے سے ہوں، ان کی چار اقسام ہیں: مباح، مستحب، واجب اور فرض۔ ایک پانچویں قسم 'زلۃ' کی بھی ہے لیکن وہ اس باب (یعنی اتباع کے باب) میں داخل نہیں ہے، کیونکہ 'زلۃ' میں آپؐ کی اقتداء جائز نہیں ہے۔ اس باب میں ان افعال کے حکم کو بیان کیا جائے گا جن میں آپؐ کی اقتداء ہوگی۔ اسی لیے نیند یا بے ہوشی کے عالم میں آپؐ سے صادر ہونے والے افعال کا تذکرہ اس جگہ نہیں ہوگا، کیونکہ ان حالتوں میں آپؐ سے صادر ہونے والے افعال میں آپؐ کا قصد وارادہ شامل نہیں ہوتا ہے، لہٰذا ان حالتوں میں آپؐ سے

صادر ہونے والے افعال حکم شرعی میں داخل نہ ہوں گے۔ جہاں تک 'زلۃ' کا معاملہ ہے تو اس میں عین فعل کا قصد نہیں ہوتا لیکن اصل فعل کی طرف قصد موجود ہوتا ہے''۔(۱۰)

علامہ علاؤالدین بخاریؒ (متوفی ۷۳۰ھ) لکھتے ہیں:

''بنیادی طور پر افعال کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ان افعال کی ہے جن کا صرف وجود ہو اور کوئی زائد صفت (مثلاً ارادہ وغیرہ) ان کے ساتھ متصل نہ ہو۔ جیسا کہ کسی سوتے ہوئے یا بھولے ہوئے آدمی کا فعل ہے۔ یہ افعال نہ تو حسن ہوں گے اور نہ ہی قبیح ہو سکتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ افعال شامل ہیں جن کے وجود کے ساتھ کوئی زائد صفت (مثلاً ارادہ وغیرہ) بھی شامل ہو' جیسا کہ مکلفین کے افعال ہیں۔ ان افعال کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم 'حسن' کہلاتی ہے اور دوسری 'قبیح'۔ 'حسن' کی آگے مزید تین قسمیں ہیں' یعنی واجب' مندوب اور مباح۔ اور 'قبیح' کی دو قسمیں ہیں' یعنی حرام و مکروہ۔ اور ان تمام افعال کا صدور سوائے آخری قسم (یعنی قبیح) کے تمام مکلفین سے ممکن ہے' چاہے وہ انبیاءؑ ہوں یا عام انسان۔ جہاں تک آخری قسم (یعنی قبیح) کا تعلق ہے تو انبیاء کے سوا تمام لوگوں سے اس کا وقوع ممکن ہے جبکہ انبیاءؑ سے ان افعال کا صدور ممکن نہیں ہے جو کہ معصیت ہوں' کیونکہ عام مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے کہ انبیاء کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے معصوم ہوتے ہیں۔ ہمارے اصحاب (یعنی حنفیہ) کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء صغائر سے بھی پاک ہوتے ہیں اگرچہ وہ 'زلۃ' کا ارتکاب کر سکتے ہیں' جبکہ بعض اشعریہ کا عقیدہ اس کے برعکس ہے (یعنی ان کے نزدیک انبیاء 'زلۃ' کے علاوہ صغائر کے بھی مرتکب ہو سکتے ہیں)۔ پس یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس باب میں افعال سے مراد آپؐ کے وہ افعال ہیں جو قصد و ارادے سے واقع ہوں اور 'زلۃ' کی قبیل سے نہ ہوں' کیونکہ اس باب میں آپؐ کی اتباع کا مسئلہ زیر بحث ہے اور آپؐ کے جو افعال بھول چوک میں سے ہوں یا بے ہوشی و نیند کی حالت میں آپؐ سے صادر ہوئے ہوں تو ان میں آپؐ کی اقتداء درست نہیں ہے..... 'زلۃ' میں عین فعل کا ارادہ نہیں ہوتا لیکن اصل فعل کا قصد ضرور ہوتا ہے..... ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ علیہ نے عصمت انبیاء کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'زلۃ' کا معنی یہ نہیں ہے کہ وہ حق سے باطل اور اطاعت سے معصیت کی طرف پھسل گئے' بلکہ اس کا اصل معنی یہ ہے کہ وہ افضل سے مفضول اور زیادہ صحیح سے صحیح کی طرف مائل ہو گئے''۔(۱۱)

☆ علامہ علاؤالدین بخاریؒ (متوفی ۷۳۰ھ) کی اس مذکورہ بالا عبارت میں ایک قابل غور اہم نکتہ یہ ہے کہ انہوں نے مباح کو 'قبیح' کے بالمقابل 'حسن' کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ پس 'مباح' اگرچہ 'حسن' ہوتا ہے لیکن اس پر کوئی اجر و ثواب نہیں ہوتا۔ علامہ صاحب اپنی کتاب میں مباح کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و أما الثالث فهو المباح إذ ليس فى أدائه ثواب' و لا فى تركه عقاب(۱۲)

''تیسری قسم مباح ہے جس کی ادائیگی میں نہ تو کوئی ثواب ہے اور نہ ہی اس کے چھوڑنے پر کوئی سزا ہے''۔

☆ مذکورہ بالا بحث سے ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'مباح' پر اگر اجر وثواب نہیں ہے تو اس کو 'حسن' کس پہلو سے کہا گیا ہے؟ بعض اصولیین نے 'مباح' کے 'حسن' ہونے کی بحث کو مستقل طور پر بیان کیا ہے اور اس میں اس نکتے کی بھی وضاحت کی ہے۔ امام غزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ) لکھتے ہیں:

''اگر یہ کہا جائے کہ کیا مباح 'حسن' ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ اگر تو 'حسن' سے مراد یہ ہے کہ فاعل کو اس کو کرنے کی اجازت ہے تو اس اعتبار سے مباح 'حسن' ہے۔ اور اگر 'حسن' سے مراد یہ ہے کہ اس کے فاعل کی تعظیم کی جائے اور اس کا فاعل قابل تعریف ہو اور اسی طرح 'قبیح' سے مراد یہ ہے کہ اس کے فاعل کی مذمت یا سزا کا اعتقاد ہو تو اس معنی میں مباح 'حسن' نہیں ہے''۔(۱۳)

دوسری قسم: اس قسم میں رسول اللہ ﷺ کے وہ افعال شامل ہیں جو جبلی امور سے متعلق ہیں۔ فقہائے احناف کے نزدیک یہ افعال بالاتفاق مباح ہیں۔ علامہ علاؤالدین بخاریؒ لکھتے ہیں:

''علماء نے اللہ کے رسول ﷺ کے ان تمام افعال کی شرعی حیثیت کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو بھول چوک یا سہو کے علاوہ ہیں —— مثلاً آپ کا ظہر کی دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دینا یہاں تک کہ ذوالیدین نے کہا: اے نبی ﷺ! کیا نماز کم ہوگئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں؟ —— اور ایسے طبعی افعال کے علاوہ ہیں جن سے کوئی بھی ذی روح مخلوق خالی نہیں ہوتی۔ مثلاً سانس لینا' کھڑا ہونا' بیٹھنا' کھانا' پینا وغیرہ۔ یہ تمام افعال آپؐ اور اُمت کے حق میں مباح ہیں اور ان کے مباح ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے''۔(۱۴)

علامہ ابن الھمامؒ (متوفی ۸۶۱ھ) اور ابن امیر حاج الحنفیؒ (متوفی ۸۷۱ھ) لکھتے ہیں:

(مسألة الاتفاق فی أفعاله الجبلية) أی الصادرة بمقتضی طبيعته ﷺ فی أصل خلقته كالقيام و القعود و النوم و الأكل و الشرب(الإباحة لنا و له)(۱۵)

''رسول اللہ ﷺ کے جبلی افعال جو کہ آپؐ سے بتقاضائے طبیعت صادر ہوئے ہیں' جیسا کہ کھڑا ہونا' بیٹھنا' سونا' کھانا اور پینا وغیرہ' تو اس کے بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ یہ تمام افعال آپؐ اور امت کے حق میں مباح ہیں''۔

☆ اس بحث میں پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ مباح کی تعریف احناف کے نزدیک بالاتفاق یہ ہے کہ جس کے کرنے پر کوئی ثواب نہ ہو اور نہ ہی اس کے ترک پر عذاب ہو۔ علامہ علاؤالدین بخاریؒ فرماتے ہیں:

''تیسری قسم مباح ہے جس کی ادائیگی میں نہ تو کوئی ثواب ہے اور نہ ہی اس کے چھوڑنے پر کوئی سزا ہے''۔(۱۶)

پس احناف کے نزدیک اللہ کے رسول ﷺ کے جبلی افعال کی مطلق پیروی پر کوئی ثواب نہیں ہے۔

☆ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ امام جصاصؒ (متوفی ۳۷۰ھ) کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے ایسے افعال جو کہ امت کے حق میں 'مباح' ہیں' ان کے لیے لفظ 'سُنّت' بھی استعمال نہیں ہوسکتا ہے۔

قال أبو بكر: و أحكام السنة على ثلاثة أنحاء: فرض' و واجب' و ندب' و ليس يكاد يطلق على المباح لفظ السنة' لأن قد بينا: أن معنى السنة: أن يفعل' أو يقول' ليقتدى به فيه' و يداوم عليه' و يستحق به الثواب' و ذلك معدوم فى قسم المباح(۱۷)

''امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ: سُنّت کے احکام تین قسم پر ہیں۔ فرض' واجب اور مندوب۔ اور مباح فعل پر لفظ 'سُنّت' کا اطلاق درست نہیں ہے' کیونکہ ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ 'سُنّت' کا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کوئی کام کریں یا کوئی حکم اس لیے دیں کہ اس میں آپؐ کی اقتداء کی جائے' اس پر عمل میں دوام اختیار کیا جائے اور اس پر عمل سے ثواب حاصل ہو' اور یہ تینوں باتیں مباح میں معدوم ہیں''۔

☆ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ بعض فقہائے احناف نے رسول اللہ ﷺ کے جبلی امور کی پیروی کو 'حسن' کہا ہے تو اس سے ان کی یہ مراد نہیں ہے کہ وہ ان افعال کو 'مباح' بھی کہتے ہیں اور باعث اجر وثواب بھی سمجھتے ہیں۔ ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ فقہائے احناف کے نزدیک واجب اور مندوب کی طرح مباح بھی 'حسن' کی ایک قسم ہے۔ اور 'حسن' سے مراد بعض اوقات ایسے افعال بھی ہوتے ہیں جو کسی اخروی اجر وثواب کے وعدے کے بغیر بھی کسی اور پہلو سے 'حسن' ہوتے ہیں۔ علامہ ابن الھمامؒ اور ابن امیر الحاج الحنفیؒ لکھتے ہیں:

''سُنّت دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ سُنّت الھدیٰ جس کو قائم کرنا تکمیل دین کے لیے ہوتا ہے اور اس کے بلا عذر تارک' جبکہ وہ اس کے ترک پر مصر بھی ہو' کو گمراہ قرار دیا جائے گا اور وہ قابل مذمت ہوگا۔ جیسا کہ فرض نمازوں کے لیے اذان کی مثال ہے..... اور سُنّت کی دوسری قسم سُنّت الزائدۃ ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا کھانا' بیٹھا اور لباس پہننا۔ فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ سنن الزوائد کو اختیار کرنا 'حسن' ہے اور ان کے چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے' یعنی ان کو چھوڑنا ناپسندیدہ یا برا نہیں ہے''۔(۱۸)

یہ وہی انداز ہے جو ہم نے عمامے کی بحث میں اختیار کیا ہے کہ اگر کوئی شخص ہم سے یہ سوال کرے کہ عمامہ باندھنا چاہیے یا نہیں' تو ہم اسے یہی جواب دیں گے کہ باندھنا چاہیے' لیکن اس کا باندھنا دین کا موضوع نہیں ہے کہ جس کے چھوڑنے کو ناپسندیدگی یا بری نظروں سے دیکھا جائے۔ ڈاکٹر وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

''کیا مباح 'حسن' ہے یا نہیں' تو اس مسئلے میں راجح مسلک تفصیل ہے۔ اور وہ یہ کہ مباح اس اعتبار سے تو 'حسن' ہے کہ اس کے فاعل کو اس کے کرنے کی اجازت ہے یا اس اعتبار سے بھی 'حسن' ہوسکتا ہے کہ اس کی اپنے مقصود سے موافقت ہے۔ لیکن مباح اس اعتبار سے بالکل بھی 'حسن' نہیں ہے کہ اس کا فاعل قابل تعریف ہو''۔(۱۹)

☆ آخری نکتہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعض وہ جبلی افعال جو قرآن کی کسی ایسی نص کا بیان بن رہے ہوں جس کا اصل حکم وجوب یا استحباب کے درجے میں ہو تو پھر یہ جبلی افعال کم از کم مستحب ضرور ہوں گے اور ان کی اتباع باعث اجر وثواب ہوگی۔ امام ابوبکر جصاصؒ (متوفی ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں:

''اور اللہ کے رسول ﷺ کے ایسے افعال جو ہر شخص کو پیش آتے ہیں اور کوئی بھی عادتاً ان سے مستغنی نہیں ہوسکتا ہے، مثلاً کھانا، پینا، کھڑا ہونا، بیٹھنا اور سونا وغیرہ جیسا کہ آپؐ کے بارے میں مروی ہے کہ جب آپؐ اپنے گھر میں ہوتے تو اپنا جوتا خود گانٹھ لیتے تھے اور اپنا کپڑا خود سی لیتے تھے۔ آپؐ کے ایسے افعال وجوب کے درجے کے نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ آپؐ ان افعال سے علیحدہ نہیں رہ سکتے تھے اور ان افعال کو کرنے کی حاجت ہر کسی کو پیش آتی ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی ہے کہ ان افعال میں ہر کسی کے لیے آپؐ کی اقتداء ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ ان افعال کا ہر حال میں کرنا محال ہے۔ جوتے کو گانٹھ لینے اور کپڑے کو سی لینے کے عمل کے ظاہری فعل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپؐ نے ان افعال کو ہمارے حق میں واجب کرنے کا ارادہ نہیں فرمایا تھا۔ یہ بھی امکان ہے کہ آپؐ سے اس قسم کے افعال تقرب الی اللہ کی نیت سے وارد ہوئے ہوں کیونکہ ان افعال کو کرتے وقت آپؐ نے تواضع، ترکِ تکبر، گھر والوں کے ساتھ مساوات کا ارادہ کیا تاکہ اس پر اللہ کی طرف سے اجر وثواب ہو اور آپؐ کی امت بھی آپؐ کی اس مسئلے میں اقتداء کرے''۔ (۲۰)

اس بحث کو آئندہ صفحات میں امام جصاصؒ کے حوالے سے بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔

تیسری قسم: یہ قسم سہو وجبلی افعال کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے ارادی افعال پر مشتمل ہے۔ آپؐ کے ارادی افعال کی بھی فقہائے احناف نے دو قسمیں بنائی ہیں۔ پہلی قسم آپؐ کے ان افعال پر مشتمل ہے جن کی صفت اللہ کے رسول ﷺ کے حق میں واضح ہو، یعنی ان افعال کا آپؐ کے حق میں فرض، واجب، مستحب یا مباح ہونا معلوم ہو۔ امام سرخسیؒ (متوفی ۴۸۳ھ) فرماتے ہیں:

وكان أبو الحسن الكرخي رحمه الله يقول: إن علم صفة فعله أنه فعله واجبا أو ندبا أو مباحا فإنه يتبع فيه بتلك الصفة(۲۱)

''ابوالحسن کرخیؒ فرماتے تھے کہ اگر آپؐ کے کسی فعل کی صفت معلوم ہو جائے کہ آپؐ نے اس کو واجب، مندوب یا مباح سمجھ کر کیا ہے تو آپؐ کی اس فعل میں پیروی اسی صفت (یعنی وجوب، ندب یا اباحت) کے ساتھ کی جائے گی''۔

علامہ علاؤالدین بخاریؒ (متوفی ۷۳۰ھ) لکھتے ہیں:

ثم بعد ذلك إما أن علمت صفة ذلك الفعل في حقه عليه السلام أو لم تعلم، فإن علمت فالجمهور على أن أمته مثله..... وذهب شرذمة إلى أن حكم ما علمت صفته كحكم مالم تعلم صفته هكذا ذكر بعض الأصوليين(۲۲)

''پھر اس کے بعد یا تو اس فعل کی صفت (یعنی اس کا واجب' مندوب یا مباح ہونا) آپؐ کے حق میں معلوم ہوگا یا نہیں۔ اگر تو آپؐ کے حق میں اس فعل کی صفت معلوم ہے تو جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ آپؐ کی امت بھی (اس فعل پر عمل کرنے میں) آپ کی مانند ہوگی.....اور ایک چھوٹی جماعت کا کہنا یہ ہے کہ آپؐ کے جن افعال کی صفت معلوم ہو ان کا حکم بھی ان افعال جیسا ہی ہے جن کی صفت معلوم نہ ہو۔ بعض اصولیین نے اسی طرح اس کا ذکر کیا ہے''۔

و الاتباع: أن يفعل مثل فعله' و فى حكمه' فإذا فعله واجبا' فعلنا على الوجوب' و إذا فعله ندبا' أو مباحا' فعلناه كذلك' لنكون قد وفينا الاتباع حقه..... فكان الاتباع و التأسى: أن نفعل مثل ما فعله' على الوجه الذى فعله عليه[۲۳]

''اتباع سے مراد یہ ہے کہ کوئی امتی ویسا ہی کام کرے جو کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے اور اس کام کے حکم میں بھی آپؐ کی اتباع کرے۔ یعنی جب آپؐ نے ایک کام کو واجب سمجھ کر کیا ہے تو ہم بھی اس کو واجب سمجھ کر کریں اور اگر آپؐ نے کسی فعل کو مندوب یا مباح سمجھ کر کیا ہو تو ہم بھی اسے مندوب یا مباح سمجھ کر کریں' تاکہ ہم اتباع کا صحیح معنی میں حق ادا کرنے والے ہو جائیں.....پس اتباع اور پیروی سے مراد ہے کہ ہم وہ کام کریں جو آپؐ نے کیا ہے اور اس ارادہ و نیت کے ساتھ کریں جس ارادہ و نیت سے آپؐ نے کیا ہے''۔

پس رسول اللہ ﷺ کے وہ افعال جن کی صفت آپؐ کے حق میں معلوم ہو' ان افعال کی پیروی و اتباع اسی صفت کے ساتھ جائز ہے۔ یعنی اگر واجب کو واجب' مندوب کو مندوب اور مباح کو مباح سمجھ کر کیا جائے۔

۞ امام ابوبکر جصاصؒ (متوفی ۳۷۰ھ) کی مذکورہ بالا عبارت میں ایک اہم نکتہ جو بیان ہوا ہے وہ متابعت یا اتباع کی تعریف ہے۔ امام صاحبؒ کے بقول آپؐ نے جس فعل کو مباح سمجھ کر ادا کیا تو امت کے لیے بھی یہ لازم ہے کہ اسے مباح سمجھ کر ادا کرے اور جس فعل کو آپؐ نے مستحب جانتے ہوئے ادا کیا تو امت بھی اس فعل کی ادائیگی کے وقت اس کے مستحب ہونے کا عقیدہ رکھے۔ اگر آپؐ نے کسی فعل کو مباح سمجھا اور امت نے اس کو مستحب بنا دیا یا آپؐ نے کسی فعل کو مستحب سمجھ کر ادا کیا اور امت نے اسے واجب بناتے ہوئے اس پر عمل شروع کر دیا تو یہ آپؐ کی اتباع یا متابعت تصور نہیں ہوگی۔ اس کا واضح معنی و مفہوم یہی ہے کہ اگر آپؐ نے کدو تقرب الی اللہ یا ثواب کی نیت سے نہیں کھائے بلکہ مباح سمجھ کر کھائے ہیں تو اگر کوئی امتی کدو کھانے کے فعل کو مستحب بنا لے اور اس کے کھانے کو باعث ثواب سمجھے تو اس نے ایک ایسے فعل کو مستحب بنا دیا جو کہ اللہ کے رسول ﷺ کے نزدیک مباح تھا۔ اسی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اتباع میں امام ابن تیمیہؒ نے 'مجموع الفتاویٰ' میں بدعت کا نام دیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ کسی امتی کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ وہ اس فعل کو مستحب (یعنی باعث اجر و ثواب) قرار دے جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے فعل سے مباح قرار دیا ہے؟ **فافهم و تأمل !**

۞ دوسرا اہم نکتہ اس بحث میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس قسم کے تمام افعال کو بھی علمائے احناف نے واجب یا مستحب قرار نہیں دیا ہے بلکہ ان افعال میں بھی ایک قسم مباح ہے جس کے ارتکاب پر کسی امتی کے لیے اجر وثواب کا کوئی عقیدہ رکھنا درست نہیں ہے۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں:

''اللہ کے رسول ﷺ کے افعال جو آپؐ سے قصد و ارادے سے صادر ہوئے ہوں، تین قسم پر ہیں: واجب، مندوب اور مباح، سوائے ان افعال کے جن کے بارے میں کوئی دلیل ہو کہ وہ ان صغائر میں سے ہیں جن کی معافی ہو چکی ہے''۔(۲۴)

۞ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ امام جصاصؒ (متوفی ۳۷۰ھ) اور تقریباً تمام اصولیین نے رسول اللہ ﷺ کے ارادی افعال کی تین قسمیں بنائی ہیں اور فرض و واجب کو علیحدہ علیحدہ بیان نہیں کیا جبکہ امام سرخسیؒ (متوفی ۴۸۳ھ) اور امام بزدویؒ (متوفی ۴۸۳ھ) نے فرض اور واجب کے فرق کو بیان کرتے ہوئے آپؐ کے ارادی افعال کی چار قسمیں بنائی ہیں۔ علامہ علاؤالدین بخاریؒ (متوفی ۷۳۰ھ) لکھتے ہیں:

ثم الشيخ و شمس الأئمة رحمهما الله قسما أفعاله عليه السلام سوى الزلة و ما ليس عن قصد على أربعة أقسام فرض و واجب و مستحب و مباح و القاضي الإمام و سائر الأصوليين قسموها على ثلاثة أقسام واجب، مستحب و مباح(۲۵)

''پھر امام بزدویؒ اور امام سرخسیؒ نے اللہ کے رسول ﷺ کے ان افعال کے علاوہ جو کہ بھول چوک میں سے ہیں یا قصداً نہیں ہیں، باقی افعال کو چار قسموں فرض، واجب، مستحب اور مباح میں تقسیم کیا ہے، جبکہ امام ابوبکر جصاصؒ اور باقی اصولیین نے ان کو واجب، مستحب اور مباح میں تقسیم کیا ہے''۔

چوتھی قسم: یہ قسم رسول اللہ ﷺ کے ان ارادی افعال پر مشتمل ہے جن کی صفت یعنی ان کا فرض، واجب، سُنّت یا مباح ہونا واضح نہ ہو، نہ آپؐ کے حق میں اور نہ ہی امت کے حق میں۔ امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

وكان أبو الحسن الكرخي رحمه الله يقول: إن علم صفة فعله أنه فعله واجبا أو ندبا أو مباحا فإنه يتبع فيه بتلك الصفة، وإن لم يعلم فإنه يثبت فيه صفة الإباحة، ثم لا يكون الاتباع فيه ثابتا إلا بقيام الدليل وكان الجصاص رحمه الله يقول بقول الكرخي رحمه الله إلا أنه يقول: إذا لم يعلم فالاتباع له في ذلك ثابت حتى يقوم الدليل على كونه مخصوصا وهذا هو الصحيح.(۲۶)

''اور امام ابوالحسن کرخیؒ فرماتے تھے کہ اگر آپ ﷺ کے فعل کی صفت معلوم ہو کہ وہ واجب ہے یا مندوب یا مباح، تو اس فعل میں آپؐ کی اتباع اسی صفت کے ساتھ ہوگی اور اگر اس فعل کی صفت آپؐ کے حق میں معلوم نہ ہو تو آپؐ کا وہ فعل مباح متصور ہوگا اور اس فعل میں (امت کے لیے) آپؐ کی اتباع اسی وقت ثابت ہوگی جبکہ اس کی کوئی دلیل ہو۔ امام جصاصؒ کا بھی وہی موقف ہے جو کہ امام کرخیؒ کا ہے (یعنی آپؐ کے جن افعال کی صفت معلوم نہ ہو وہ مباح افعال متصور ہوں گے)

لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر آپؐ کے کسی فعل کی صفت معلوم نہ ہو (تو وہ مباح تو ہوگا) لیکن اس میں آپؐ کی اتباع ثابت ہے الا یہ کہ اس فعل کے آپؐ کے ساتھ مخصوص ہونے کی کوئی دلیل ہو''۔

علامہ علاؤالدین بخاریؒ (متوفی ۷۳۰ھ) لکھتے ہیں:

''اگر آپؐ کے کسی فعل کی صفت معلوم نہ ہو (کہ وہ واجب ہے یا مندوب یا مباح) اور اس فعل کا تعلق معاملات سے ہو تو بالاجماع وہ فعل مباح ہے۔ ابوالیسرؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور اگر وہ فعل (جس کی صفت معلوم نہ ہو) عبادات سے متعلق ہو تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ آپؐ کے ایسے افعال کے بارے میں توقف کیا جائے گا اور ان پر وجوب' ندب یا اباحت میں سے کوئی بھی حکم نہ لگایا جائے گا اور ہمارے لیے آپؐ کے ایسے افعال میں اتباع اس وقت تک ثابت نہ ہوگی جب تک کہ کوئی ایسی دلیل نہ ہو جو اس فعل کے وصف (یعنی وجوب' ندب یا اباحت) کو ظاہر کر دے اور امت کی اس فعل میں آپؐ کے ساتھ شرکت کو بھی ثابت کرے۔ عام اشاعرہ اور شوافع کی ایک جماعت امام غزالی' ابوبکر دقاق اور ابوالقاسم بن کجؒ وغیرہ کا یہی موقف ہے۔ جبکہ علماء کی ایک دوسری جماعت کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے لیے آپ ﷺ کے ایسے افعال میں آپؐ کی اتباع واجب ہے اور ان افعال کا کرنا آپؐ پر بھی واجب ہے اور امت پر بھی۔ یہ امام مالکؒ کا مذہب ہے اور شوافع میں سے ابوالعباس' اصطخری' ابن ابی ہریرۃ اور ابن خیرانؒ کا بھی یہی موقف ہے۔ حنابلہ اور معتزلہ کی ایک جماعت نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے''۔ (۲۷)

امام جصاصؒ (متوفی ۳۷۰ھ) احناف کے اس موقف کے دلائل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر یہ کہا جائے کہ اگر تم نے نبی ﷺ کے ایسے فعل (کہ جس کی صفت وجوب' ندب یا اباحت معلوم نہ ہو) کو مباح سمجھ کر عمل کر لیا تو تم اس اندیشے سے بے خوف نہیں ہو سکتے کہ نبی ﷺ نے اس فعل کو مندوب یا واجب سمجھ کر کیا ہو اور تم نے نبی ﷺ کی مخالفت کی ہو۔ ایسے شخص کو یہ جواب دیا جائے گا: اگر آپؐ نے اس فعل (کہ جس کی صفت معلوم نہ ہو) کو مندوب یا واجب سمجھ کر کیا ہوتا تو آپؐ اپنے اس فعل کی اس صفت کو ضرور بیان کرتے' کیونکہ ہم اس کے محتاج ہیں۔ پس جب آپؐ نے اپنے کسی فعل کی صفت واضح نہیں کی تو ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ آپؐ نے ہمیں یہ فعل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے اور آپؐ کا یہ فعل ہمارے حق میں مباح ہے۔ پس اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ آپؐ نے اگر اس فعل (کہ جس کی صفت واضح نہیں ہے) کو مباح سمجھ کر کیا تھا تو آپؐ اس کی اباحت کو ہی واضح کر دیتے (لیکن آپؐ نے اس کی اباحت کو واضح نہیں کیا) پس جس طرح آپؐ کے لیے یہ جائز تھا کہ آپؐ ایک مباح کام کریں اور اس کی اباحت کو بیان نہ کریں تو اسی طرح آپؐ کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ آپؐ کسی کام کو مندوب یا واجب سمجھ کر کریں اور اس کے ندب یا وجوب کو بیان نہ کریں۔ ہم اس کو شخص کو یہ جواب دیں گے: یہ لازم نہیں ہے کہ ایسا ہی ہو۔ آپؐ کے لیے یہ تو جائز تھا کہ آپؐ تمام کے تمام مباحات کو بیان نہ کریں جبکہ ہمارے دین میں تمام مباحات سے

واقفیت ضروری نہیں ہے' کیونکہ مباحات کے ارتکاب پر نہ تو کوئی ثواب ہے اور نہ ہی ان کے انکار پر کوئی سزا ہے۔ جہاں تک مندوب و واجب کا تعلق ہے تو اس کے بیان کو ترک کرنا آپؐ کے لیے جائز نہیں تھا کیونکہ ہم مندوب و واجب کی معرفت کے محتاج ہیں تا کہ مندوب کے کرنے سے ثواب ہو اور واجب کو ترک کرنے سے ہم محرمات میں نہ جا پڑیں''۔(۲۸)

☆ جیسا کہ امام جصاصؒ نے بیان کیا ہے' ایک اہم نکتہ اس بحث میں یہ ہے کہ آپؐ کے اس قسم کے تمام افعال کو بھی علمائے احناف نے واجب یا مستحب قرار نہیں دیا ہے بلکہ ان افعال میں بھی ایک قسم 'مباح' ہے کہ جس کے ارتکاب پر کسی امتی کے لیے اجر و ثواب کا کوئی عقیدہ رکھنا درست نہیں ہے۔

☆ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن کی وہ عمومی آیات کہ جن میں اللہ کے رسول ﷺ کی مطلق اتباع کا تذکرہ ہے' ان سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید آپؐ کی یہ اتباع آپؐ کے ہر ہر فعل میں امت کے حق میں واجب یا فرض ہے۔ امام سرخسیؒ (متوفی ۴۸۳ھ) ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

ففی قوله: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ دليل على أن التأسى به فى أفعاله ليس بواجب' لأنه لو كان واجبا لكان من حق الكلام أن يقول عليكم' ففى قوله"لكم" دليل على أن ذلک مباح لنا لا أن يكون لازما علينا والأمر بالاتباع التصديق و الاقرار بما جاء به' فإن الخطاب بذلک لأهل الكتاب وذلک بين فى سياق الآية(۲۹)

''اللہ کے اس قول ''البتہ تحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے'' میں اس بات پر دلیل ہے کہ آپؐ کے افعال میں آپؐ کی پیروی واجب نہیں ہے' کیونکہ اگر آپؐ کے افعال میں آپؐ کی پیروی واجب ہوتی تو پھر آیت مبارکہ میں 'لکم' کی بجائے 'علیکم' کے الفاظ ہوتے۔ پس اللہ تعالیٰ کے الفاظ 'لکم' میں اس بات کی دلیل ہے کہ آپؐ کے افعال کی اتباع امت کے حق میں مباح ہے نہ کہ لازم۔ اور 'فَاتَّبِعُوْنِیْ' میں اتباع سے مراد اللہ کے رسول ﷺ جس کو لے کر آئے ہیں اس کی تصدیق و اقرار کرنا ہے (یعنی اتباع سے مراد آپؐ کی باتوں پر ایمان لانا ہے) کیونکہ آیت کے سیاق میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ ان آیات میں اصل خطاب اہل کتاب سے ہے''۔

پانچویں قسم: فقہائے حنفیہ کے نزدیک پانچویں قسم آپ ﷺ کے ان افعال پر مشتمل ہے جو قرآن کی کسی نص کا بیان ہوں۔ آپؐ کے ان افعال کا وہی حکم ہوگا جو کہ اصل یعنی مبیَّن کا ہوگا۔ امام جصاص فرماتے ہیں:

''آپ ﷺ کا فعل کسی مجمل نص کا بیان بن رہا ہو اور اس مجمل نص کا حکم وجوب' ندب یا اباحت کا ہو تو جو حکم اس مجمل نص کا ہوگا وہی حکم آپؐ کے فعل کا بھی ہوگا۔ اگر اس مجمل نص کا حکم وجوب کا ہے تو

اس نص کے بیان میں جو آپ ؐ کا فعل ہوگا وہ بھی واجب ہوگا۔اور اگر وہ مجمل نص مندوب کے درجے میں ہوتو اس کے بیان میں آپ ؐ کا فعل بھی مندوب ہوگا اور اگر وہ مجمل نص مباح کا درجہ رکھتی ہوتو اس کے بیان میں آپ ؐ کا فعل بھی مباح ہوگا..... چنانچہ جب آپ ؐ کا فعل کسی مجمل نص کا بیان بن رہا ہو اور وہ واجب کے درجے میں ہوتو اس کی مثال فرض نمازوں کی رکعات ہیں جو کہ قرآن کی مجمل نص ﴿اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ کا بیان ہیں۔اسی طرح حج میں آپ ﷺ کے افعال ﴿وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ﴾ کی مجمل نص کا بیان ہیں۔اسی طرح ایک ایسی مجمل نص جو کہ مندوب کے حکم میں ہو اس کے بیان کی مثال ﴿وَافۡعَلُوا الۡخَیۡرَ﴾ اور ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ﴾ ہے کیونکہ تمام قسم کی بھلائیوں پر عمل واجب نہیں ہے اور اسی طرح تمام قسم کے احسانات جو کہ آپ ؐ نے کیے ہیں وہ بھی واجب نہیں ہیں، جیسا کہ نفلی صدقات اور نفلی نماز وغیرہ''۔(۳۰)

امام جصاص ؒ نے اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ اگر کسی مجمل نص کا حکم وجوب کا ہے تو یہ لازم نہیں ہے کہ اس نص کے بیان میں آپ ﷺ کے ہر ہر فعل کا حکم بھی وجوب کا ہی ہو، یعنی اس نص کے بیان میں بعض افعال کا حکم تو وجوب کا ہی ہوگا لیکن بعض افعال مندوب یا مباح بھی ہوں گے۔جیسا ﴿اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ کا مجمل حکم تو وجوب کا ہے لیکن آپ ؐ نے اس کے بیان میں جو بھی افعال مثلاً رکوع، سجدہ، قومہ، جلسہ استراحت، تکبیرات، تسبیحات، قعدہ وتشہد وغیرہ کیے ہیں وہ سب واجب نہیں ہیں۔یعنی نماز کے تمام افعال وجوب کا درجہ نہیں رکھتے ہیں۔

☆ مذکورہ بالا بحث میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ کسی مجمل نص کے بیان میں رسول اللہ ﷺ کے بعض افعال اباحت کے درجے میں ہیں کہ ان کے ارتکاب پر ثواب کا عقیدہ نہیں رکھا جائے گا۔

☆ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ بعض اوقات آپ ﷺ کے جبلی افعال بھی قرآن کی ان نصوص کے بیان سے متعلق ہوتے ہیں کہ جن کا اصل حکم وجوب یا استحباب کے درجے کا ہوتا ہے، لہٰذا آپ ؐ کے یہ جبلی افعال کم از کم استحباب کا درجہ ضرور رکھتے ہیں۔

چھٹی قسم: چھٹی قسم آپ ﷺ کے ان افعال پر مشتمل ہے جو کہ آپ ؐ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں۔آپ ؐ کے ان افعال میں بھی بالاتفاق اتباع نہیں ہے۔علامہ علاؤالدین بخاری ؒ لکھتے ہیں:

''(اور آپ ﷺ کے افعال میں آپ ؐ کی اتباع کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے) کہ وہ فعل آپ ؐ کی ذات سے مخصوص نہ ہو، جیسا کہ چاشت اور تہجد کی نماز کا آپ ؐ کے حق میں واجب ہونا یا آپ ؐ کو چار سے زائد نکاح کی اجازت ہونا اور مال غنیمت کا کچھ حصہ اپنے لیے خاص کر لینا اور 'خمس' کا پانچواں حصہ وغیرہ۔کیونکہ ان افعال میں آپ ؐ کے ساتھ امت کے شریک ہونے کی بالاتفاق کوئی دلیل نہیں ہے''۔(۳۲)

سوال: برصغیر پاک وہند میں حنفیہ کے علاوہ اہل الحدیث کی ایک بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔کسی اہل

حدیث عالم دین کی اس مسئلے میں اصولی گفتگو پر روشنی ڈالیں۔

جواب: شیخ صالح العثیمین کے شاگرد دکتور خالد بن علی المشیقح☆ اصولِ فقہ پر ان کی منظوم کتاب کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

واعلم أن أفعال النبیﷺ تنقسم إلی ثلاثة أقسام: القسم الأول: ما فعله النبیﷺ علی وجه القربة و الطاعة..القسم الثانی: ما فعله النبیﷺ لا علی وجه القربة والطاعة وهذا تحته أقسام: القسم الأول: ما فعله النبیﷺ بمقتضی الجبلة و الطبیعة فهذا فی حد ذاته لا یتعلق به أمر ولا نهی فلا تقول للإنسان إنک تفعل کذا أو لا تفعل کذا...الخ. مثال ذلک: نوم النبیﷺ و أکله و شربه ونکاحهإلخ. لکن هیئات مثل هذه الأشیاء قد یتعلق بها أمر أونهی فالأکل قد یتعلق به أمر وقد یتعلق به نهی کالأکل بالیمین، و الشرب بالیمین، والتسمیة، والحمدلة، ولا یأکل مایضره...إلخ. وکذلک النوم فانه ینام علی طهارة، و علی جنبه الأیمن، ویذکر أذکار النوم...إلخ. وأما ذات النوم، وذات الأکل والشرب...إلخ. فهذه الأشیاء فعلها النبیﷺ جبلة فلا یتعلق بها أمر أو نهی.القسم الثانی: ما فعله النبیﷺ علی وجة العادة فهذا أیضا مباح: مثل کیفیة الأکل، والشرب و اللباس هذه من قبیل العادات لکن الشارع قد یأمر ببعض الکیفیات و ینهی عن بعض، مثل أن یأکل کذا، أو یشرب کذا، أو یأکل علی هذه الهیئة أو ینام علی هذه الهیئة...إلخ. ما فعله النبیﷺ علی سبیل العادة هذا لا نقول بأن الإنسان مأمور أن یتابع النبیﷺ فی هذه الأشیاء فإنه لا یتعلق بها أمر أو نهی، بل السنة للإنسان أن یفعل العادة فی المکان والزمان الذی هو فیه ما لم یخالف الشرع یعنی یوافق أهل بلده فی عادتهم.مثال ذلک: النبی ﷺ لبس العمامة لکن عادة الناس فی مثل هذا البلد أنهم یلبسون عمامة، والسنة أن الإنسان یوافق الزمان والمکان الذی هو موجود فیه کلبس الشماغ أو الغترة..إلخ فیوافقهم فی ذلک ما لم بخالف الشرع، لأنه لو خالف الناس لأصبح لباسه لباس شهره.وأیضا: النبیﷺ رکب الخیل والحمار والناس الآن فی هذا البلد لا یرکبون الخیل و الحمار...إلخ فهل نقول بأنک توافق النبیﷺ فی عادته، أو نقول له ارکب السیارة مثل فعل الناس؟ والسنة أن یترک مثل هذه الأشیاء و یفعل ما یفعله الناس، لأن کونه یوافق الناس هذه یبعده عن الشهرة و کونه یرکب الخیل ویقول أرید أن أقتدی بالنبیﷺ نقول: هذا من قبیل العادات و النبیﷺ فعل

مایوافق أهل بلده و زمانه وأنت السنة أن توافق زمانک و مکانک[۳۳]

''جان لو! اللہ کے رسول ﷺ کے افعال تین قسم پر ہیں۔ پہلی قسم ان افعال کی ہے جن کو آپؐ نے اللہ کی عبادت واطاعت کے لیے کیا... دوسری قسم ان افعال کی ہے کہ جن کو آپؐ نے اللہ کی عبادت و اطاعت کے پہلو سے نہیں کیا۔ اس دوسری قسم کی پھر کئی ایک اقسام ہیں۔ پہلی قسم تو وہ افعال ہیں جن کا جبلت اور طبیعت تقاضا کرتی ہے۔ پس اس قسم کے افعال کے ساتھ کوئی امر یا نہی لاحق نہیں ہوتی۔ پس آپ کسی بھی شخص کو اس قسم کے افعال میں یہ نہیں کہیں گے کہ تم ایسا کرو یا تم ایسا نہ کرو۔ اس کی مثال اللہ کے رسول ﷺ کا سونا' کھانا' پینا اور نکاح کرنا وغیرہ ہے۔ یہ واضح رہے کہ ان افعال کی بعض ہیئات ایسی ہوتی ہیں کہ جن کے ساتھ کوئی نہ کوئی امر یا نہی لاحق ہوتی ہے۔ پس کھانے کے فعل کے ساتھ بعض اوقات کوئی امر متعلق ہوتا ہے اور بعض اوقات کوئی نہی لاحق ہوتی ہے۔ مثلاً دائیں ہاتھ سے کھانا' دائیں ہاتھ سے پینا' کھانے' پینے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا' کھانے پینے کے بعد الحمد للہ کہنا' ایسی چیز نہ کھانا جو کہ مضرت رساں ہو (لہٰذا ان صفات کے ساتھ کھانا' پینا مستحب ہے)۔ اسی طرح سونے کے فعل میں یہ مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ باوضو اور دائیں پہلو پر سوتے تھے (لہٰذا اس طرح سے سونا مستحب اور باعث اجر وثواب ہے)۔ اور سونے سے پہلے ذکر اذکار کرتے تھے۔ جہاں تک مجرد سونے یا کھانے کے فعل کا تعلق ہے تو آپ ﷺ نے یہ افعال جبلی تقاضے کے تحت کیے تھے لہٰذا ان کے ساتھ کوئی امر یا نہی متعلق نہیں ہے۔ دوسری قسم ان افعال کی ہے جن کو آپؐ نے عادتاً (رواج کے تحت) کیا ہو۔ یہ افعال بھی مباح ہیں۔ مثلاً کھانے' پینے اور لباس کی کیفیات وغیرہ عادات کی قبیل سے ہیں۔ لیکن بعض اوقات شارع بعض افعال میں بعض کیفیات کے اختیار کا حکم دیتے ہیں اور بعض کیفیات سے منع کرتے ہیں' مثلاً یہ کہ اس طرح سے کھائے یا اس طرح سے پیے یا اس ہیئت کے ساتھ کھائے یا اس ہیئت کے ساتھ سوئے۔ پس آپؐ نے جو کام عادتاً کیے ہیں تو ان افعال کے بارے میں ہم یہ نہیں کہتے کہ انسان کو یہ لازمی حکم ہے کہ ان افعال میں آپؐ کی پیروی کرے کیونکہ ان افعال کے ساتھ کوئی امر یا نہی لاحق نہیں ہے۔ بلکہ اصل سُنّت تو یہ ہے کہ انسان عادی امور میں اپنے علاقے اور زمانے کے رسم ورواج کے مطابق عمل کرے جب تک کہ وہ رسم ورواج شریعت کے خلاف نہ ہو۔ مراد یہ ہے کہ انسان اپنے ملکی رواج کی پیروی کرے۔ اس کی مثال اللہ کے نبی ﷺ کا عمامہ پہننا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کے ملک میں لوگوں کا عرف یہ ہے کہ وہ عمامہ نہیں پہنتے تو انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے زمانے اور علاقے کے لوگوں کی موافقت کرے (اور عمامہ پہننے کی بجائے اپنے علاقے کے رواج کے مطابق لباس مثلاً) سعودی رومال وغیرہ پہنے۔ پس انسان اپنے علاقے کے لوگوں کی موافقت اس وقت تک کرے گا جب تک شرع کی مخالفت نہ ہو کیونکہ اگر وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے لباس کی مخالفت کرے گا تو اس کا لباس شہرت کا لباس بن جائے گا۔ اسی طرح آپؐ نے گدھے اور گھوڑے کی سواری کی جبکہ آج ان

علاقوں میں گھوڑوں اور گدھوں کی سواری نہیں ہوتی۔ پس کیا ہم کسی شخص سے یہ کہیں کہ تم آج بھی اللہ کے رسول ﷺ کی موافقت واتباع میں گھوڑے یا گدھے کی سواری کرو یا ہم لوگوں سے یہ کہیں کہ آپ اور لوگوں کی طرح گاڑی وغیرہ کی سواری کریں کیونکہ اس مسئلے میں اپنے علاقے کے لوگوں کی موافقت اس شخص کو شہرت سے دور رکھے گی۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر آج اس لیے سفر کرتا ہوں تا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کروں تو ہم اس سے یہ کہیں گے کہ آپ ﷺ نے اپنے فعل کے ذریعے اپنے زمانے اور علاقے کے لوگوں کی موافقت کی (یعنی آپؐ نے وہ سواری سفر کے لیے اختیار کی جو کہ آپؐ کے علاقے و زمانے میں رائج تھی مثلاً اونٹ، گھوڑا اور گدھا وغیرہ) اور تمہارے لیے سُنّت یہ ہے کہ تم بھی اپنے فعل میں اپنے زمانے اور علاقے کے لوگوں کی موافقت کرو۔ (یعنی سفر کے لیے وہی سواری اختیار کریں جو ان کے علاقے اور زمانے کی سواری ہے، پس اصل سُنّت اہل زمان ومکان کی موافقت ہوئی نہ کہ آپ ﷺ کے ظاہری فعل کی پیروی)''۔

سوال: کبھی آپ یہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کا سونا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا اور پینا وغیرہ مباح افعال ہیں اور اس کے ثبوت میں علماء کے اقوال نقل کرنا شروع کر دیتے ہیں اور کبھی آپ یہ کہتے ہیں کہ آپؐ کا کھانا، پینا، سونا وغیرہ سے متعلق بہت سے ایسے احکامات ہیں جو استحباب یا وجوب کا درجہ رکھتے ہیں اور اس کے حق میں علماء کے فتاویٰ نقل کرتے ہیں۔ ذرا تفصیل سے اپنے موقف کو واضح کریں، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

جواب: ہماری ساری بحث کو اب ایک سادہ سی مثال کے ذریعے سمجھیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا سونا جبلی تقاضے کے تحت تھا لہٰذا مجرد سونا ایک مباح امر ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص یہ سوچ کر سوتا ہے کہ آپ ﷺ بھی تو سوئے تھے تو اس کا یہ سونے کا فعل باعث اجر وثواب نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ اس طریقے سے سوتا ہے جس طریقے سے سونے کی آپؐ نے تعلیم دی ہے تو اب اس سونے کے فعل میں اس کو اجر ملے گا۔ سونے کے عمل کے بارے میں نبی ﷺ کی بعض تعلیمات مروی ہیں، جن میں بعض استحباب کا درجہ رکھتی ہیں، جبکہ بعض اسباب کے تحت ہیں اور بعض مباح ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سونے کے عمل کی درج ذیل سُنّتیں ہیں، یعنی اگر کوئی شخص سونے کے عمل سے پہلے درج ذیل اعمال کرے گا تو یہ اعمال اس کے لیے اجر و ثواب کا باعث ہوں گے، کیونکہ روایات سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سونے کے عمل سے پہلے تقرب الی اللہ کی نیت سے خود سے ان اعمال کو کیا یا ان کے کرنے کی تلقین کی۔

۱۔ رات سونے سے پہلے 'اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَمُوْتُ وَاَحْیَا' پڑھنا۔ (۳۴)

۲۔ رات سونے سے پہلے دونوں ہاتھوں میں پھونک ماریں اور آخری تین سورتیں پڑھ کر جہاں تک ممکن ہو لیٹے لیٹے سر، چہرے اور جسم کے اگلے حصے پر ہاتھ پھیریں اور اس عمل کو تین مرتبہ دہرائیں۔ (۳۵)

۳۔ رات سونے سے پہلے آیت الکرسی پڑھنا۔ (۳۶)

۴۔ سونے سے پہلے 'بِاسْمِکَ رَبِّ وَضَعْتُ جَنْبِیْ وَبِکَ اَرْفَعُہٗ اِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْھَا

وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادِکَ الصَّالِحِیْنَ پڑھنا۔(۳۷)

۵۔ سونے سے پہلے 'اَللّٰھُمَّ خَلَقْتَ نَفْسِیْ وَاَنْتَ تَوَفَّاھَا لَکَ مَمَاتُھَا وَمَحْیَاھَا اِنْ اَحْیَیْتَھَا فَاحْفَظْھَا وَاِنْ اَمَتَّھَا فَاغْفِرْلَھَا ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ الْعَافِیَۃَ پڑھنا۔(۳۸)

۶۔ سونے سے پہلے 'اَللّٰھُمَّ قِنِیْ عَذَابَکَ یَوْمَ تُبْعَثُ عِبَادَکَ پڑھنا۔(۳۹)

۷۔ سونے سے پہلے ۳۳ مرتبہ الحمدللہ، ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھنا۔(۴۰)

۸۔ سونے سے پہلے 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمْنَا وَسَقَانَا وَکَفَانَا وَآوَانَا فَکَمْ مِمَّنْ لَا کَافِیَ لَہٗ وَلَا مُؤْوِیَ' پڑھنا۔(۴۱)

۹۔ سونے سے پہلے 'اَللّٰھُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ رَبَّ کُلِّ شَیْءٍ وَمَلِیْکَہٗ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَمِنْ شَرِّ الشَّیْطٰنِ وَشِرْکِہٖ وَاَنْ اَقْتَرِفَ عَلٰی نَفْسِیْ سُوْءً اَوْ اَجُرَّہٗ اِلٰی مُسْلِمٍ' پڑھنا۔(۴۲)

۱۰۔ سونے سے پہلے 'اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْکَ وَوَجَّھْتُ وَجْھِیَ اِلَیْکَ وَاَلْجَاْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ رَغْبَۃً وَرَھْبَۃً اِلَیْکَ لَا مَلْجَاَ وَلَا مَنْجَا مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ آمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ پڑھنا۔(۴۳)

۱۱۔ سونے سے پہلے ' اَللّٰھُمَ رَبَّ السَّمٰوَاتِ وَرَبَّ الْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ رَبَّنَا وَرَبَّ کُلِّ شَیْءٍ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰی وَمُنْزِلَ التَّوْرَاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْفُرْقَانِ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ کُلِّ شَیْءٍ اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِیَتِہٖ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الْآخِرُ فَلَیْسَ بَعْدَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الظَّاھِرُ فَلَیْسَ فَوْقَکَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَکَ شَیْءٍ اقْضِ عَنَّا الدَّیْنَ وَاَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ' پڑھنا۔(۴۴)

۱۲۔ سونے سے پہلے سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات کا پڑھنا۔(۴۵)

۱۳۔ سونے سے پہلے سورۃ الکافرون پڑھنا۔(۴۶)

۱۴۔ سونے سے پہلے سورۃ الملک پڑھنا۔(۴۷)

۱۵۔ سونے سے پہلے سورۃ الم سجدۃ پڑھنا۔(۴۸)

۱۶۔ باوضو ہو کر سونا۔(۴۹)

۱۷۔ دائیں پہلو پر لیٹنا۔(۵۰)

۱۸۔ دایاں ہاتھ دائیں رخسار کے نیچے رکھنا۔(۵۱)

۱۹۔ آپ ﷺ نے سونے سے پہلے بستر جھاڑنے کا حکم دیا۔(۵۲)

۲۰۔ سونے سے پہلے کھانے پینے کی چیزوں اور برتنوں کو ڈھانپنے کا بھی حکم دیا گیا۔(۵۳)

یہ بیس سنن ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں احادیث وروایات ہی میں ایسے قرائن ودلائل موجود ہیں جو اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ سنن شرعیہ ہیں۔یعنی ان افعال میں آپ ﷺ کی پیروی واتباع مطلوب اور باعث اجروثواب ہے۔

ان کے علاوہ جب بعض ایسی روایات پر غور کرتے ہیں کہ جن کا تعلق سونے کے آداب کے ساتھ ہے تو مختلف قرائن یہ واضح کرتے ہیں کہ یہ آداب سننِ شرعیہ میں سے نہیں ہیں۔مثلاً ایک صحیح روایت کے مطابق آپ ﷺ نے رات کو چراغ جلا کے سونے سے منع فرمایا۔اب آپؐ کا یہ حکم کسی سبب کے تحت تھا' جیسا کہ بعض دوسری روایات میں آتا ہے کہ مدینہ میں رات کے وقت ایک گھر میں آگ لگ گئی اور آپؐ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے کہا: ''رات کو سونے سے پہلے چراغ بجھا دیا کرو''۔اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ رات کو سونے سے پہلے چراغ اس لیے بجھا دیا کرو کہ کوئی چوہیا وغیرہ اس کی آگ سے کھیل کر پورے گھر کو آگ لگانے کا باعث نہ بن جائے۔پس اگر کوئی شخص اس روایت سے یہ حکم نکالے کہ رات کو سوتے وقت لائٹ جلانا جائز نہیں ہے یا لائٹ آف کر کے ہی سونا مستحب و پسندیدہ ہے تو ہمارے خیال میں یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے۔اگر کوئی شخص کسی وجہ سے رات کو لائٹ آن کر کے سوتا ہے تو سُنّت کی مخالفت نہیں کر رہا ہے۔اسی طرح سونا ایک مباح امر ہے اور دن و رات کے کسی بھی وقت میں انسان سو سکتا ہے بشرطیکہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو رہی ہو۔لہٰذا اگر کسی شخص کی ملازمت کی صورت ایسی ہے کہ وہ رات کو جاگتا ہے اور دن کو سوتا ہے مثلاً چوکیدار وغیرہ تو یہ سُنّت کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے۔اسی طرح اگر کوئی رات کو دیر تک جاگتا رہے اور اپنی نیند پوری کرنے کے لیے فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد سو جائے تو یہ بھی سُنّت کی خلاف ورزی نہیں ہے' کیونکہ کوئی ایسی صحیح روایت مروی نہیں ہے کہ جس میں صبح کی نماز کے بعد سونے سے منع کیا گیا ہو۔ہاں ایسی روایت ضرور موجود ہے جس میں عشاء کی نماز سے پہلے سونے سے منع کیا گیا ہے' لیکن اس کا سبب بھی یہ ہے کہ رات کی نماز ضائع نہ ہو جائے' کیونکہ بعض دوسری صحیح روایات میں موجود ہے کہ آپ ﷺ بعض اوقات عشاء کی نماز کے لیے اپنے حجرے سے رات گئے نکلتے تھے اور صحابہؓ اس دوران نماز کے انتظار میں مسجد میں سو رہے ہوتے تھے۔پس اگر نماز کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو ضرورت کے تحت عشاء سے پہلے سونے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔اسی طرح زمین پر یا کسی چارپائی و پلنگ وغیرہ پر سونا یا نہ سونا بھی کوئی دین کا موضوع نہیں ہے۔انسان جہاں چاہے سو جائے۔

پس ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعض افعال تو واقعتاً ایسے ہیں جو سنن شرعیہ کا درجہ رکھتے ہیں' اور ایسے اعمال بلاشبہ ۲۴ گھنٹوں میں ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں' جیسا کہ ہم نے ایک سونے کے عمل کے بارے میں ۲۰ سنن نقل کر دی ہیں' لیکن آپؐ کے بعض اعمال وافعال ایسے ہیں جو سنن شرعیہ کا درجہ نہیں رکھتے' بلکہ زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں جو حکم لگایا جا سکتا ہے وہ اباحت یا

جواز کا ہے۔ پس آپؐ کے ایسے افعال جو اباحت کے درجے میں ہیں' کی ترغیب وتشویق کی بجائے ہمیں عامۃ الناس کو فرائض کی ادائیگی' محرمات سے اجتناب اور ایسی سنن کی پابندی کی تلقین کرتے رہنا چاہیے جن کے استحباب کے بارے میں واضح قرائن موجود ہیں۔ عامۃ الناس کی اکثریت تو ایسی ہے جو فرائض کو ادا نہیں کر رہی اور محرمات سے اجتناب نہیں کرتی' ان کو عمامے یا تہبند کی ترغیب وتشویق دلانا دعوتِ دین کی حکمت کے بھی منافی ہے۔ جتنا وقت ہم لوگوں کو عمامے اور تہبند کی تلقین میں صرف کرتے ہیں اگر وہی وقت ہم لوگوں کو فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب کرنے کی موعظت ونصیحت میں کھپائیں تو یہ اس وقت کا صحیح وزیادہ قیمتی مصرف ہوگا' کیونکہ ابھی ہم یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہمارے معاشرے کے تمام مسلمان تمام فرائض دینیہ کو ادا کرنے یا محرمات سے اجتناب کرنے والے بن گئے ہیں۔

حواشی

(۱) تفسیر اللباب فی علوم الکتاب' آل عمران:۱۳۷۔

(۲) التقریر و التحبیر : الباب الثالث السنة۔ (۳) البحر المحیط : مباحث السنة۔

(٤) الموافقات' ج۲' جزء٤' ص ۷۔ (٥) مجموع الفتاویٰ' جلد۱۸' ص ٦' ۷۔

(٦) ارشاد الفحول' المقصد الثانی فی السنة۔

(۷) الفصول فی الاصول : باب القول فی افعال النبی ﷺ۔

(۸) کشف الاسرار' باب اقسام العزیمة۔ (۹) اصول البزدوی' باب افعال النبی ﷺ۔

(۱۰) اصول السرخسی' باب الکلام فی افعال النبی ﷺ۔

(۱۱) کشف الاسرار شرح اصول البزدوی' باب افعال النبی ﷺ۔

(۱۲) کشف الاسرار' باب اقسام العزیمة۔

(۱۳) المستصفی: القطب الاول فی الثمرة وهی الحکم' مسالة الجائز لا یتضمن الامر والمباح۔

(۱٤) کشف الاسرار شرح اصول البزدوی' باب افعال النبی ﷺ۔

(۱٥) التقریر والتحبیر: المقالة الثانیة فی احوال الموضوع' مسألة الاتفاق فی افعاله الجبلیة الصادرة بمقتضی طبعیته۔

(۱٦) کشف الاسرار' باب اقسام العزیمة۔

(۱۷) الفصول فی الاصول' باب القول فی سنن رسول الله ﷺ۔

(۱۸) التقریر والتحبیر: المقالة الثانیة فی احوال الموضوع' تقسیم الحنفیة الحکم اما رخصة او عزیمة۔

(۱۹) اصول الفقه الاسلامی' ج۱' ص۹۰۔

(۲۰) الفصول فی الاصول' باب القول فیما یستدل به علی احکام افعاله علیه السلام۔

(۲۱) اصول السرخسی' باب افعال الرسول۔

(۲۲) کشف الاسرار' باب افعال النبی ﷺ۔

(۲۳) الفصول فی الاصول' باب القول فی افعال النبی ﷺ۔

(٢٤) الفصول فی الاصول، باب القول فی افعال النبی ﷺ۔
(٢٥) کشف الاسرار، باب افعال النبی ﷺ۔
(٢٦) اصول السرخسی، باب الکلام فی افعال النبی ﷺ۔
(٢٧) کشف الاسرار، باب افعال النبی ﷺ۔
(٢٨) الفصول فی الاصول، باب القول فی افعال النبی ﷺ۔
(٢٩) اصول السرخسی، باب الکلام فی افعال النبی ﷺ۔
(٣٠) الفصول فی الاصول، باب القول فیما یستدل به علی احکام افعاله علیه السلام۔
(٣١) الفصول فی الاصول، باب القول فیما یستدل به علی احکام افعاله علیه السلام۔
(٣٢) کشف الاسرار، باب افعال النبی ﷺ۔
(٣٣) العقد الثمین فی شرح منظومة الشیخ ابن العثیمین، ص ٧٦، ٧٧۔
(٣٤) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب وضع الید الیمنی تحت الخد الایمن۔
(٣٥) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل المعوذات۔
(٣٦) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق ، باب صفة ابلیس و جنوده۔
(٣٧) صحیح البخاری، کتاب الدعوات ، باب التعوذو القراءة عند المنام۔
(٣٨) صحیح مسلم، کتاب الذکر و الدعاء و التوبة و الاستغفار، باب ما یقول عند النوم و أخذ المضجع۔
(٣٩) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب منه۔
(٤٠)صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب خادم المرأة۔
(٤١)سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب ما جاء فی الدعاء اذا آوی الی فراشه۔
(٤٢) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب منه۔
(٤٣) صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب فضل من بات علی الوضوء۔
(٤٤) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب ما یقول عند النوم واخذ المضجع۔
(٤٥) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن،باب فی کم یقرأ القرآن۔
(٤٦) سنن الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول الله، باب منه۔
(٤٧) سنن الترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل سورة الملك۔
(٤٨)سنن الترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل سورة الملك۔
(٤٩) صحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب فضل من بات علی الوضوء۔
(٥٠) صحیح مسلم، کتاب الذکر و الدعاء و التوبة و الاستغفار، باب ما یقول عند النوم و أخذ المضجع۔
(٥١) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب وضع الید الیمنی تحت الخد الأیمن۔
(٥٢) صحیح مسلم، کتاب الذکر و الدعاء و التوبة و الاستغفار، باب ما یقول عند النوم و أخذ المضجع۔
(٥٣) صحیح البخاری، کتاب الاستئذان، باب اغلاق الأبواب باللیل۔

بندے کا دولت میں حقیقی حصہ

مدرس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((**یَقُوْلُ الْعَبْدُ مَالِیْ مَالِیْ وَاِنَّمَا لَـہٗ مِنْ مَّالِہٖ ثَلَاثٌ: مَا اَکَلَ فَاَفْنٰی اَوْ لَبِسَ فَاَبْلٰی اَوْ اَعْطٰی فَاقْتَنٰی وَمَا سِوٰی ذٰلِکَ فَھُوَ ذَاھِبٌ وَتَارِکُہٗ لِلنَّاسِ**)) (رواہ مسلم واحمد)☆

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ کہتا ہے میرا مال میرا مال' حالانکہ اس کے مال میں سے جو واقعی اُس کا ہے وہ بس تین مدیں ہیں: ایک وہ جو اس نے کھا کے ختم کر دیا۔ دوسرا وہ جو پہن کر پرانا کر ڈالا اور تیسرا وہ جو اُس نے راہِ خدا میں دیا اور اپنی آخرت کے واسطے ذخیرہ کر لیا' اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بندہ دوسرے لوگوں کے لیے اُس کو چھوڑ جانے والا ہے اور خود یہاں سے ایک دن رخصت ہو جانے والا ہے''۔

انسان روزی کمانے کی جدوجہد کرتا ہے اور ہر وقت مال اکٹھا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ پھر اپنا مال اور جائیداد دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے یہ میرا مال ہے' یہ میرا مال ہے' یہ میرا مکان ہے' یہ میری زمین ہے' یہ میری حویلی ہے' یہ میرا کارخانہ ہے۔ زندگی بھر یہی راگ الاپتا رہتا ہے' حتیٰ کہ اُس کی موت کا وقت آ جاتا ہے۔ اُس وقت اُس کا سارا مال اور جائیداد پڑی رہ جاتی ہے جو اسی وقت اس کی ملکیت سے نکل کر اس کے وارثوں کا مال بن جاتا ہے' اور وہ خود خالی ہاتھ سفید کفن پہن کر قبر میں اتر جاتا ہے۔

اسلام زندگی گزارنے کا نہایت عمدہ اور اچھا انداز بتاتا ہے۔ چنانچہ اس حدیث میں مال جمع کرنے اور اس کو سنبھال کر رکھنے سے بڑے حکیمانہ طریقے سے منع کیا ہے اور حقیقت حال ان الفاظ میں واضح کی ہے کہ جس مال کو وہ اپنا مال کہتا ہے اور جسے اس نے بڑی جدوجہد اور محنت کے ساتھ کمایا ہے دراصل اُس میں سے اس کا مال صرف وہ ہے جو اس نے کھا پی کر ختم کر لیا' یا پھر اپنے لباس پر خرچ کیا یا وہ اللہ کی راہ میں نیک کاموں پر خرچ کر کے توشۂ آخرت بنا لیا۔ اس کے علاوہ جتنا بھی مال اس نے پس انداز کیا وہ اس کے وارثوں کا ہے۔ اگر وہ اس کو نیک کاموں میں خرچ کریں گے تو ثواب پائیں گے' اگر برے کاموں میں خرچ کریں گے تو گناہ حاصل کریں گے۔

☆ صحیح مسلم' کتاب الزھد والرقائق۔ ومسند احمد: ۸۴۵۷

اس حدیث میں انسان کو حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے نصیحت کی گئی ہے کہ جس قدر ممکن ہو اپنا مال اللہ کی راہ میں اور نیک کاموں میں خرچ کرنا چاہیے' کیونکہ جو مال اس طرح خرچ کیا گیا وہ توشۂ آخرت بن گیا اور مرنے والا جو مال چھوڑ گیا اس کے بارے میں جواب دہی تو اسے کرنا پڑے گی جبکہ اس سے فائدہ دوسرے اٹھائیں گے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَیُّکُمْ مَالُ وَارِثِہٖ اَحَبُّ اِلَیْہِ مِنْ مَّالِہٖ؟)) قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ: مَا مِنَّا اَحَدٌ اِلَّا مَالُہٗ اَحَبُّ اِلَیْہِ مِنْ مَّالِ وَارِثِہٖ' قَالَ: ((فَاِنَّ مَالَہٗ مَا قَدَّمَ وَمَالَ وَارِثِہٖ مَا اَخَّرَ)) (رواہ البخاری)

یعنی تم میں سے کون ایسا ہے جس کو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال محبوب ہو؟ لوگوں نے عرض کیا ہم میں سے تو ہر ایک کا حال یہ ہے کہ اس کو اپنے وارثوں کے مال سے زیادہ محبوب اپنا ہی مال ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب یہ بات ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ آدمی کا مال بس وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا اور جس قدر اس نے بچا کر رکھا وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے وارثوں کا ہے (پس عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کو وارثوں کے لیے مال چھوڑنے سے زیادہ فکر اپنی آخرت کے لیے سرمایہ محفوظ کرنے کی ہونی چاہیے جو اسی صورت میں ممکن ہے کہ مال جمع کرنے کی دھن کو طبیعت پر غالب نہ آنے دے بلکہ کشادہ دلی کے ساتھ مال کا بڑا حصہ خیر کے کاموں میں خرچ کرتا رہے)۔ جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو دنیا میں اُس کے دوست احباب اور رشتہ دار یہ کہتے ہیں کہ اتنا مال چھوڑ کر مرا' بڑی دولت کمائی' اپنی اولاد کے لیے بڑی جائیدادیں بنائیں' مگر حقیقت یہ ہے کہ محنت و مشقت سے کمایا ہوا یہ مال اس کے کسی کام نہیں آتا بلکہ الٹا اسے اس مال کی جواب دہی کرنا ہوگی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا مَاتَ الْمَیِّتُ قَالَتِ الْمَلَائِکَۃُ مَا قَدَّمَ وَقَالَ بَنُوْ آدَمَ مَا خَلَّفَ)) (رواہ البیہقی)

''جب مرنے والا مرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں کہ اس نے اپنے واسطے آگے کیا بھیجا؟ (یعنی آخرت میں کام آنے والے کون سے نیک عمل کیے؟) جبکہ عام لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس نے کتنا مال چھوڑا؟''

حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کے اعمالِ خیر اور فی سبیل اللہ خرچ ہی اس کے لیے آخرت کا ذخیرہ ہے۔ جس شخص کو اللہ نے امورِ خیر میں خرچ کرنے کی توفیق دی ہے وہ بڑا ہی خوش قسمت ہے' کیونکہ ہر ایک نے موت کا ذائقہ چکھ کر اللہ کے حضور پیش ہونا ہے' جہاں اُس سے دیگر سوالوں کے ساتھ خصوصی طور پر یہ سوال پوچھا جائے گا کہ مال کہاں سے کمایا اور کس جگہ خرچ کیا؟ اگر مال جائز طریقے سے کمایا ہوگا اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوگا تو ایسا شخص حقیقی کامرانی سے بہرہ مند ہوگا' ورنہ کفِ افسوس ملنے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ انسان کی اصلی اور کام آنے والی کمائی تو وہی ہے جو اس نے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے آخرت کے لیے

محفوظ کر لی۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید میں بڑی واضح راہنمائی موجود ہے۔ سورۃ الحشر میں ارشاد ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ (آیت ۱۸)

''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر شخص غور سے دیکھتا رہے (دھیان رکھے) کہ وہ کل (آنے والی زندگی) کے لیے کیا آگے بھیج رہا ہے!''

پس انسان کو اس چند روزہ زندگی میں اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ روزی حلال اور جائز طریقے سے کمائے اور اس آمدنی کو اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے' مگر ضروری ہے کہ اپنی کمائی کا ایک حصہ فی سبیل اللہ خرچ کرے اور یہی خرچ کرنا اس کے لیے توشۂ آخرت ہوگا' جیسا کہ اس حدیث میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ بندے کی کمائی میں سے دراصل اُس کا مال وہی ہے جو اس نے خیر کے کاموں میں لگایا۔ یہ مال اُس وقت اس کے کام آئے گا جب وہ بے یار و مددگار ہوگا اور کوئی اس کی دستگیری کرنے والا نہ ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے ایک بکری ذبح کی اور اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ اس کا گوشت لوگوں میں تقسیم کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آپؐ گھر والوں میں واپس آئے تو پوچھا کہ بکری کے گوشت کا کیا ہوا؟ بتایا گیا کہ تمام گوشت لوگوں میں تقسیم کر دیا ہے' البتہ بکری کی ایک ''دستی'' (کَتِف) اپنے استعمال کے لیے رکھ لی گئی ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا نہ کہو' بلکہ یوں کہو کہ بکری کا سارا گوشت محفوظ ہو گیا ہے سوائے ایک دستی کے''۔ استفسار کرنے پر آپ ﷺ نے وضاحت کی کہ جو گوشت تم نے اللہ کی رضا کے لیے تقسیم کر دیا ہے وہ تو تمہارا توشۂ آخرت بن گیا اور جو تم نے اپنے کھانے کے لیے رکھ لیا وہ توشۂ آخرت نہ بنا' کیونکہ اس کو خود کھا کر ختم کر دیا جائے گا۔

پس انسان کا مال اپنی کمائی میں سے وہی ہے جو اُس نے اپنے ہاتھوں خرچ کر دیا' غرباء' مساکین اور دیگر مستحقین کو اللہ کی رضا کے لیے دیا' یا پھر رفاہِ عامہ کے کاموں میں لگایا' یا کسی دنیوی مفاد کے بغیر دین اسلام کی سربلندی کے لیے خرچ کیا۔ ایسا مال یقیناً اس کے لیے توشۂ آخرت ثابت ہوگا۔

تعارف وتبصرہ

(۱)

نام کتاب : **بیان القرآن** (حصہ اول)

تالیف : محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ
بانی تنظیم اسلامی وصدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مرتب : حافظ خالد محمود خضر

ضخامت:520 صفحات سائز:23x36/16 عمدہ کاغذ خوبصورت ٹائٹل نفیس جلد قیمت:400 روپے

ناشر:انجمن خدام القرآن سرحد A-18 ناصر مینشن ریلوے روڈ نمبر 2 شعبہ بازار پشاور

ملنے کے پتے:(۱) انجمن خدام القرآن سرحد پشاور (۲) مکتبہ خدام القرآن K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہٗ کسی معروف علمی گھرانے کی بجائے ایک عام مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے طبیعت سلیم عطا فرمائی اور ماحول بھی پاکیزہ میسر آیا' جس کی بدولت بچپن اور لڑکپن میں علامہ اقبال کے کلام کے ساتھ ساتھ ''مسدسِ حالی'' اور ''شاہنامہ اسلام'' کے مطالعہ سے شعوری سطح پر یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا میں مسلمانوں کی ذلت ورسوائی کا سبب یہ ہے کہ ان کا قرآن حکیم سے تعلق منقطع ہو چکا ہے۔یعنی: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

اس شعور کا ظہور بچپن میں ہی آپ کے سیکنڈری سکول کے زمانے میں ہونے لگا۔اسی زمانے میں آپ کا تعارف ''تفہیم القرآن'' اور پھر صاحب تفہیم القرآن سے ہو گیا' اور یہ تعارف وتعلق یہیں پر نہیں رکا بلکہ براہِ راست قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے ہو گیا۔ یہ تعارف وتعلق اتنا بڑھا کہ قرآن نے آپ کو مسخر کرلیا اور آپ نے صاحب قرآنؐ کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنانے کا عزم مصمم کرلیا۔

آپ نے ایم بی بی ایس کی تعلیم کے باوجود خدمت قرآن کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا یہی وہ جذبہ ہے جو ڈاکٹر صاحب کو کسی پل آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا۔آپ کا درسِ قرآن درس برائے درس نہیں ہوتا بلکہ اس میں ایک مقصدیت کارفرما ہوتی ہے' اور وہ مقصد یہ ہے کہ اُمت مسلمہ قرآنی احکامات کو سمجھے اور ان پر عمل پیرا ہو۔اللہ تعالیٰ نے محترم ڈاکٹر صاحب کے بیان وکلام میں جو وارفتگی اور جوش وخروش رکھا ہے وہ اس

کے کلام ہی کا فیض ہے' اور اس حوالے سے آپ کو جو عزت و مقام حاصل ہوا ہے وہ دراصل اس کلام اللہ کے بیان کی وجہ سے ہے۔ بقول شاعر:۔

اُنہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
اُنہی کی محفل سجا رہا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی!

اور بقول حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ

ما ان مدحتُ محمدًا بمقالتی
لٰـکن مدحتُ مقالتی بمحمّدٍ

یعنی میرے کلام و اشعار کی وجہ سے محمد ﷺ کی تعریف میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ میرے کلام کو جو ارفع و اعلیٰ مقام حاصل ہوا ہے وہ اس سبب سے کہ اس میں حضور ﷺ کا ذکر ہو گیا ہے۔ کم و بیش اسی طرح کی کچھ نسبت صاحب ''بیان القرآن'' کو قرآن کی وجہ سے حاصل ہو گئی ہے۔۔

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی کہ اس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہِ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلاہ داری!

راقم کا یہ مشاہدہ ہے کہ اس وقت پورے کرۂ ارض پر جہاں بھی اردو بولنے اور سمجھنے والے مسلمان ہیں اور ان میں سے جن کو کچھ اسلام سے دلچسپی ہے وہ ''بیان القرآن'' اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیان القرآن کی آڈیو/ویڈیوز/سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور کتنی ہی انجمنیں اور خوش نصیب لوگ ہیں جو ان ڈی وی ڈیز کی کاپیاں بنا بنا کر عام کر رہے ہیں۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ''بیان القرآن'' کے ذریعے کوشش کی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں قرآن کی عظمت اور اس کا جاہ و جلال اُجاگر ہو۔ نیز یہ جس چیز کی دعوت دیتا ہے اس کو کھول کھول کر واضح فرمایا ہے۔ قاری اور سامع کو دعوت دی ہے کہ وہ قرآن کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے یہ صدا لگائیں کہ ﴿اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾۔

''بیان القرآن'' محترم ڈاکٹر صاحب کا عالمی شہرت کا حامل وہ دورۂ ترجمۂ قرآن ہے جو موصوف نے ۱۹۹۸ء کے رمضان المبارک کی مقدس راتوں میں قرآن اکیڈمی کراچی کی جامع مسجد میں فرمایا تھا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس دورۂ ترجمۂ قرآن کو اتنا قبولِ عام عطا فرمایا کہ دنیا بھر کے مختلف ٹی وی چینلز نے سیٹلائٹ کے ذریعے اس کو پورے کرۂ ارض پر دن کے چوبیس گھنٹوں میں تین تین بار دہرا دہرا کر ٹیلی کاسٹ (نشر) کیا۔ ملت اسلامیہ کے تمام مکاتب فکر کے خواتین و حضرات نے مسلکی تعصّبات سے بالاتر ہو کر بڑے ہی انہماک اور جوش و جذبے سے اس کو سنا' ہر ایک نے اپنی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق اسے سمجھا اور خوش نصیب لوگوں نے اس کے نتیجے میں اپنی زندگیاں احکامِ الٰہی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس دورۂ ترجمۂ قرآن میں ترجمہ و مختصر تشریح کے ساتھ سامعین کے ذہن میں بہت عمدگی سے یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ قرآن مجید صرف حصولِ ثواب کے لیے نازل نہیں ہوا..... اگرچہ یہ حصولِ ثواب کے لیے بھی ہے' مگر اس کے نزول کی اصل غرض و غایت

انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں ایسی ہدایت و رہنمائی ہے جو ہر قسم کے شکوک وشبہات کے شائبہ سے بالاتر ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اسلوبِ خطابت میں ایک خاص وصف عطا فرمایا ہے کہ مشکل اور پیچیدہ مضامین کو انتہائی سہل انداز میں واضح فرما دیتے ہیں اور سامعین و ناظرین کو اصطلاحات کے گورکھ دھندے میں الجھانے کی بجائے احکاماتِ قرآنی کو اس طرح واضح فرماتے ہیں کہ وہ سامع کے قلب و ذہن میں اتر جائیں اور کوئی اشکال وابہام باقی نہ رہے۔

زیرتبصرہ کتاب اس ''بیان القرآن'' میں سے سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں محترم ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ کی تحریر کردہ چھ صفحات پر مشتمل ''تقدیم'' ہے جو ''بیان القرآن'' کی وجہ تالیف بیان کرتی ہے۔ مزید برآں قریباً ۱۶۰ صفحات ''تعارفِ قرآن وعظمت قرآن'' پر مشتمل ہیں جو کہ طالبانِ علومِ قرآن کو بیسیوں کتب کی مراجعت سے مستغنی کر دیتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کتاب ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر'' کا مصداقِ کامل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ زیرتبصرہ کتاب جہاں معنوی اعتبار سے لاثانی ہے وہیں صوری اعتبارات سے بھی لاجواب ہے۔ کاغذ وطباعت کے عمدہ ہونے کے ساتھ جلد بھی مضبوط اور دیدہ زیب ہے۔

بیان القرآن (حصہ اول) کی ترتیب وتسوید کی خدمت حافظ خالد محمود خضر (مدیر شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی لاہور) نے سرانجام دی ہے اور انجمن خدام القرآن سرحد پشاور اور اس کے روح رواں محترم ڈاکٹر محمد اقبال صافی صاحب نے اسے کتابی صورت میں شائع فرما کر ایک اہم دینی ضرورت کو پورا کرنے کی سعی و جہد کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کو صحت و عافیت کے ساتھ اپنے دین متین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہمیں ان کے فیوض و برکات سے بہرہ مند فرمانے کے ساتھ ساتھ اُن کی تعلیمات کو حرزِ جاں بنانے کی توفیق عطا فرمائے اور اس بیان القرآن کو اُمت مسلمہ کی بیداری کا ذریعہ بنا دے۔ آمین یاربّ العالمین!

(تبصرہ نگار: شیخ رحیم الدین)

(۲)

نام کتاب : دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

مصنف : شیخ الحدیث مولانا حافظ ذوالفقار علی

ضخامت: 208 صفحات، قیمت: درج نہیں ہے

ملنے کا پتہ: ابوہریرہ اکیڈمی، 37۔ کریم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے کے لیے رہنمائی موجود ہے۔ عصر حاضر معاشیات کا دور کہلاتا ہے، کیونکہ دنیا پر معاشرتی وسیاسی غلبے کے لیے بظاہر فیصلہ کن اہمیت کسی ملک کے معاشی نظام وترقی کو حاصل ہے۔ قرآن مجید اور اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث میں قیامت تک کے آنے والے مسائل کا حل نصاً، قیاساً یا مصلحتاً موجود ہے۔ علماء نے ہر دور میں اجتہاد بالنص، اجتہاد بالقیاس اور اجتہاد بالقواعد العامہ کے

ذریعے پیش آنے والے مسائل کا حل قرآن وسنت کی نصوص سے مستنبط کیا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ علم معاشیات بہت سے ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی، پُرتعیش زندگی گزارنے اور بینک بیلنس بڑھانے کی ہوس ولالچ نے کمائی کے ہزاروں ایسے طریقے ایجاد کردیے ہیں جن میں مذہبی تعلیمات، اخلاقیات، انسانیت، باہمی ہمدردی اور باہمی محبت واخوت کے جذبوں کا خون کیا جاتا ہے۔

ہمارا یہ ایمان ہے کہ دین اسلام کی تعلیمات اخلاقیات، انسانی ہمدردی اور باہمی اخوت کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ لہٰذا دورِ حاضر کے جو بھی مالی معاملات قرآن وسنت کے مطابق ہوں گے، وہ دنیا وآخرت میں فلاح کا باعث بنیں گے۔ زیرنظر کتاب کا موضوع بھی یہی ہے۔ اس کتاب میں سود، کریڈٹ کارڈ، انشورنس، لیزنگ، شیئرز، ہنڈی، حقوق کی بیع، پگڑی، تکافل، اسلامی بینکوں کا طریقہ تجارت یعنی مضاربت، اجارہ، مشارکہ، متناقصہ، بیع تورق اور بیع سلم کی شرعی حیثیت کا ایک علمی، تحقیقی اور تجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ لکھنے والے تو بہت ہوتے ہیں لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جو ایسے موضوعات پر لکھتے ہیں جن پر لکھنا معاشرے کی ضرورت ہو، اور پھر ان میں سے بھی بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی موضوع پر لکھیں تو ان میں اس کی اہلیت بھی ہو اور اس کا حق بھی ادا کریں۔ زیرنظر کتاب واقعتاً ایک ایسی ہی کتاب ہے جو ہر عامی و عالمِ دین کو اس موضوع پر مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عالمِ عرب میں جدید معاشیات پر بہت کام ہوا ہے لیکن اردو زبان میں اس پر کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ کتاب اسلامی بینکاری کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے بارے میں بھی ایک اہم مصدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب تک اسلامی بینکاری کے حوالے سے جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ اس کے حق میں ہی ہے، جبکہ چند ایک مضامین وفتاویٰ کے علاوہ غالباً اس حوالے سے یہ پہلی کتاب ہے کہ اس میں اسلامی بینکاری کے حیلوں، خرابیوں اور غیرشرعی بنیادوں کا ایک علمی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

علماء، تاجر برادری اور معاشیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر طالب علم کے پڑھنے کی کتاب ہے۔ سفید کاغذ، عمدہ طباعت اور مضبوط جلد سے مزین ہے۔ (تبصرہ نگار: حافظ محمد زبیر)

(۳)

نام کتابچہ : باغ کے پھول

مصنف : پروفیسر عتیق الرحمٰن صدیقی

ضخامت: 48 صفحات قیمت: 30 روپے

ملنے کا پتہ: اذانِ سحر پبلی کیشنز، نزد منصورہ، ملتان روڈ، لاہور فون: 5435667

بچوں کی پرورش والدین کے لیے بڑا نازک اور اہم معاملہ ہے۔ بچے بڑے ہوکر والدین کے لیے نیک نامی یا بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ اس لیے ان کی تربیت میں سنجیدگی کے ساتھ جدوجہد کرنا بہت ضروری ہے۔ اس

معاملے میں غفلت بڑے بھیانک نتائج کا سبب بن سکتی ہے۔

سب سے اچھا انداز تو یہ ہے کہ والدین خود اچھے اخلاق کا مظاہرہ کریں۔ یہ خاموش طرزِ عمل انتہائی پُرتاثیر ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کو ایسی کتابیں فراہم کی جائیں جن میں اخلاقی خوبیوں کے اچھے نتائج اور بری عادات کی ہولناکیاں بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتابچہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اس میں فضائل اخلاق نہایت عمدہ انداز میں اور اچھی مثالوں کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں' جبکہ برائیوں کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں خود بخود ان سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ مصنف نے بچوں کو باغ کے پھول قرار دیا ہے۔ سچ ہے کہ گھر ایک باغ ہے اور بچے اس گھر کی رونق۔ اگر بچے سلیقہ شعار اور باادب ہوں تو گھر کا ماحول خوشیوں کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

یہ کتاب بچوں کے پڑھنے کے لیے مفید ہے۔ تحریر سادگی کا اچھا نمونہ ہے۔ بچے اس کو بڑھ کر لطف اندوز بھی ہوں گے اور سبق بھی حاصل کریں گے۔ (تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

(۴)

نام کتاب : **کتاب الدعاء والاستغفار** (دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن)

مؤلف : رشید اللہ یعقوب

ناشر: رحمۃ للعالمین ریسرچ سنٹر' مکان نمبر 8' زمزمہ اسٹریٹ نمبر 3' زمزمہ' کلفٹن' کراچی 75600' پاکستان

فون: 021-5877561

بنی نوع انسان کا مقصد تخلیق بندگیٔ رب ہے۔ عبدیت اور بندگی کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے پروردگار کے سامنے عجز و درماندگی اور فقر و احتیاج کا مظاہرہ کرے۔ جب انسان بارگاہِ ایزدی میں دست سوال دراز کرتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی محتاجی اور بے مائیگی کا اظہار کرتا ہے' اسی کیفیت کو اصطلاحِ شریعت میں 'دعا' کہا جاتا ہے۔

انسان کا فقر و احتیاج اس کی ذات کا حصہ ہے' اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے اسے ضعف و کمزوری پر تخلیق کیا ہے۔ اسی ناتوانی اور ضعف کا نتیجہ ہے کہ انسان اپنے مقصدِ وجود یعنی اطاعتِ الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے جس کی پاداش میں غضب خداوندی اور عتابِ الٰہی کی گرفت میں آ کر اپنے پروردگارِ حقیقی سے دُور ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال سے چھٹکارا پانے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تقصیر و کوتاہی پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے خداوند قدوس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی جائے۔ اسی کو استغفار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اظہارِ عبودیت اور حصولِ قربِ الٰہی کے لیے دعا و استغفار کا التزام اہل ایمان کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو دعا کے آداب و شرائط سے آگاہی ہو' اوقاتِ قبولیت کا علم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ کن اوصاف کے حاملین کی التجائیں بارگاہِ الوہیت میں قبولیت کا شرف پاتی ہیں۔ مزید

برآں ان اذکار وادعیہ سے بھی واقفیت ہونی چاہیے جو قرآنِ مقدس میں مذکور ہیں اور جن کے ذریعے سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء بارگاہِ ایزدی میں طالبِ خیرات ہوا کرتے تھے۔ بھلا ہو جناب رشید اللہ یعقوب کا کہ انہوں نے ان تمام امور کی شرح وبسط سے وضاحت کر دی ہے جیسا کہ کتاب الدعاء والاستغفار کے مطالعے سے عیاں ہے۔

رشید اللہ یعقوب اذکار وادعیہ اور اوراد ووظائف سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی دو کتابیں **اسماء اللّٰہ عزوجل** (دو جلدیں) اور **الصلوٰۃ والسلام علی رحمۃ للعالمین** شائع ہو کر عوام و خواص سے سند قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ مؤلف کی زیر تبصرہ کتاب الذکر والدعاء نو (۹) ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں فاضل مؤلف نے دعا کی فضیلت' آداب قبولیت کے اوقات اور مستجاب الدعوات لوگوں کا تذکرہ کیا ہے۔ باب دوم سے باب ہفتم تک ان ادعیہ کا ذکر کیا گیا ہے جو بالترتیب **یَارب' اللّٰھم اغفرلی' اللھم انی اسألک' اللّٰھم انی اعوذ بک' اللّٰھم اجعلنی اللّٰھم** سے شروع ہوتی ہیں۔ آٹھویں باب میں درود وسلام کے مختلف صیغے تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کا آخری باب صلاۃ التسبیح کی فضیلت وطریق کی توضیح پر مشتمل ہے۔

مذکورہ کتاب کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ ہر بات باحوالہ اور باسند بیان کی گئی ہے' جس سے اصل مصدر تک رسائی میں سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں دعا واستغفار سے متعلقہ آیات واحادیث جمع کر دی گئی ہیں جن کے مطالعہ سے خدا کے حضور دامن طلب پھیلانے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ فاضل مؤلف کی زیر تبصرہ کتاب کا حقیقی پیغام یہ ہے کہ دعا واستغفار کو اپنا روزانہ کا معمول بنایا جائے کہ دعا ہی مؤمن کا ہتھیار ہے جو اس کی ہر قسم کی مشکل ومصیبت میں کام آتا ہے اور استغفار کے ذریعے ہی انسان اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے موجودہ زوال ونکبت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم دعا سے غفلت اور استغفار سے اعراض کی روش اپنائے ہوئے ہیں۔ مذکورہ کتاب کے مطالعے سے یقینی طور پر اس صورت حال سے نجات کی راہ میسر آ سکتی ہے' لہٰذا ہر مسلم گھرانے میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ کتابِ مذکور ظاہری حسن وخوبصورتی سے بھی آراستہ ہے۔ انتہائی دیدہ زیب ٹائٹل اور اعلیٰ کاغذ کے ساتھ ساتھ طباعت کا معیار بھی بلند ترین ہے۔ پروف کی غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں اور ان سب پر مستزاد یہ کہ کتاب صدقہ جاریہ ہے' بلا قیمت مہیا کی جا رہی ہے۔ باری تعالیٰ فاضل مؤلف کی اس عظیم کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور ہمیں اپنی بارگاہ میں دست التجا دراز کرنے کا سلیقہ وتوفیق مرحمت فرمائے۔ آمین یاالٰہ العالمین!

(تبصرہ نگار: حافظ ابوعمرو عسکری)

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Al-Baqarah

Translation and Brief Elucidation

(30) *And when your Lord said to the angels: "Verily I am going to place a Khalifah (vicegerent) in the earth". The angels said, "Will You place therein the one who will create disorder therein and shed blood, while we glorify You with praises and sanctify You". Allah said, "I know what you don't know."*

This *ayah* describes the position of man in the universe. The modern civilization has degraded man to the status of an animal, which only follows its material desires; the only difference is that man is a slightly more evolved animal. But Allah (SWT) says that He has placed man as a *vicegerent* on earth, and has made him the best of all creations. In another *ayah*, Allah (SWT) says, *"O' Iblees! What prevented you from prostrating before the one I have created with My own hands".* [12] This subject, Allah (SWT) willing, will further be discussed in *surah Bani Israel*.

(31) *And Allah taught Adam the names, all of them; then presented them before the angels and said, "Tell Me the names of these if you are truthful".*

The basis of this *vicegerency* is the knowledge that Allah (SWT) granted to Adam (AS). He taught Adam (AS) the names of all things. Human knowledge is based on terminologies; every time man discovers something, he gives it a name. Every science has its own terminology, which has to be known in order to comprehend the science. So, in a way, the whole human knowledge is the knowledge of names. There are two forms of knowledge: revealed knowledge and acquired knowledge. *Revealed knowledge* is what Allah (SWT) revealed to His Prophets (AS), and is above question. Knowledge that is derived from our five senses and our own thinking, observation and experience is the *Acquired knowledge*,

which is prone to error and can be questioned. The whole acquired human knowledge was given potentially to Adam (AS), just as a seed has potentially the whole tree in it. It matured with the passage of time, just like the seed grows into a tree after passing through different stages. This does not mean that he was given the knowledge of modern science and technology, but that Allah (SWT) gave him and his children the faculties through which they could attain this knowledge with the passage of time.

Then Allah (SWT) asked the angels to tell the names taught to Adam (AS) if they were truthful. This does not imply that the angels were raising objections over making man a vicegerent on earth; it was just an inquiry out of curiosity.

(32) *The angels replied: "Glory be to You; we have no knowledge except the knowledge that you gave us. Surely You and only You are the All-Knowing, the Wise".*

This indicates that the angels have not been given the knowledge of everything. They only have the knowledge about the particular matters that Allah (SWT) has appointed them to administer. On the other hand, man has been given the faculties to obtain a vast treasure of knowledge. This is the basic difference between humans and the other creations of Allah (SWT); He did not give this knowledge to any of His creations other than the humans, and thus Allah (SWT) says, "*I know what you do not know*".

(33) *Allah said: "O Adam! Tell them the names of these", and when he told them their names, Allah said (to the angels): "Did I not tell you that I know the Ghayb (unseen) of the heavens and the earth, and know all that you reveal and all you have been concealing."*

This signifies the virtue of Adam (ASW) over the angels, who were ordered by Allah (SWT) to devote themselves to man's service. When man wants to make use of the knowledge and powers given by Allah (SWT), they co-operate with him and allow him to do whatever he likes whether right or wrong. This can be understood by an example of how the employees work under an appointed viceroy or governor of a particular government. When the Queen of England appointed the British viceroy in Delhi, all the employees were thus ordered to obey him, whether he was right or wrong, as long as the Queen permitted him to exercise his authority. Similarly Allah (SWT), the sole Sovereign, has ordered the angels to obey the humans and serve them devotedly by His permission, but if the humans transgress the limits set by Allah (SWT), the angels are ordered to destroy them or put an end to their lives.

(34) And when We said to the angels: "Prostrate before Adam", they prostrated all except Iblees; he refused and showed arrogance, and became among the disbelievers.

Iblees was apparently included in this command with the angels, although he was not one of them, as Allah says in *surah Al-Kahf*: *"All prostrated except Iblees. He was one of the Jinns."* [13]

Although *Iblees* was a dweller of the Paradise and was allowed to be with the angels due to his worship of Allah, he was not from the angelic community, but was a *Jinn*. His name was *Azazeel*, but he is called *Iblees*, meaning one who has lost all hope for Allah's mercy. The *Jinns* have been created from fire (*naar*) whereas the Angels have been created from light (*noor*). Unlike the angels, who are bound to serve and obey Allah (SWT), the *Jinns* are not free from sins. In this respect, they are more like humans; they have the choice to be obedient or disobedient to their Creator. *Iblees* considered himself to be superior to Adam (AS) and because of his conceit and jeoulosy, contravened the command of Allah (SWT) to prostrate before Adam (AS), and thus became a disbeliever.

(35) And We said: "O Adam! Dwell you and your wife in Paradise and eat both of you from it plentifully from wherever you will, but don't go near this tree or you both will be among the unjust".

There is a difference of opinion among Muslim scholars as to whether this Paradise was in the heavens or on this earth. Most of the scholars believe that it was in the heavens and Adam and Eve were sent down to this earth afterwards. But it was not the Paradise the believers will dwell in after resurrection, because once a person enters that Paradise, he will live therein forever. Allah (SWT) allowed Adam (AS) and Eve (AS) to reside in this Paradise for a while in order to test them and show them a glimpse of what was to come i.e. how *Iblees* would be an enemy to them and their progeny and would try to lead them astray, and what man would get if he obeys Allah (SWT). Adam and Eve were forbidden to go near a particular tree. There are conflicting opinions as to which tree it was, but it does not make any difference; the actual purpose was their test.

(36) Then Satan made them slip therefrom and hence got them out of what they had been in. And We said: "Go you down; you will be enemies to one another. And for you in the earth, is a dwelling place and utility for a time".

This means that *Iblees* and Adam (AS) became enemies forever. *Iblees* prayed to Allah (SWT) to grant him life till the Last Day so as to prove that the humans whom Allah (SWT) has chosen above him and all creations, are not worthy of this privilege and are disobedient to

Him. This is the basis of the struggle between good and evil, truth and falsehood, and the war between *Iblees*, alongwith his progeny and agents, and Adam's progeny. Then Allah (SWT) says: *And for you in the earth, is a dwelling place and utility for a time"* i.e. the time when you will be resurrected for the Final Reckoning.

(37) Then Adam received some words from his Lord; thereupon Allah (SWT) accepted his repentance. No doubt He is the Accepter of Repentance, the Merciful.

After Adam (AS) had committed that act of disobedience, he wanted to repent and ask for forgiveness, but did not know which words he should use for this purpose. Allah (SWT) bestowed His mercy and blessing on him and taught him the words. Thereupon, Adam and Eve prayed: *"Our Lord! We have wronged our souls and if You do not forgive us and have mercy on us, we shall certainly be among the losers."*[14]

(38) We said: "Get down from it all of you. Thereafter, if comes to you guidance from Me, then those who follow that guidance, neither fear shall come upon them nor shall they grieve".

The word used here is اهْبِطُوا, which means going down from a higher place to a lower one, and is also used for settling down in a place. We will discuss this, Allah willing, in the coming sections.

(39) And those who disbelieve and belie Our Ayaat are the people of Hellfire; they will be therein 'eternal residents'.

i.e. they will remain in the Hell forever and will not find a way out of it.

As mentioned earlier, there are two forms of knowledge; acquired and revealed. Here Allah (SWT) mentions the revealed knowledge, when He says to Adam (AS): *"If comes to you guidance from Me."* This guidance is the knowledge Allah (SWT) reveals to His selected servants in order to guide people.

The first four sections of this *surah*, which contain preliminary discussions, have concluded. The next ten sections directly address the former Muslim *ummah*, *The Children of Israel*. These ten *ruku's* can be divided into two parts. The first of these sections i.e. the fifth *ruku'* of the *surah*, which comprises seven *ayaat*, calls the *Children of Israel* to accept the Prophethood of Muhammad (SAW), whereas the next nine sections i.e. the sixth *ruku*' through to the fifteenth, consist of a continuous charge sheet against them for their sins, like breaking their covenants with Allah (SWT), introducing innovations in their belief, keeping false desires regarding the Hereafter, and disobeying Allah (SWT). As a consequence of these transgressions, they were dismissed from

their position as the representatives of Allah on earth and replaced by the new Muslim *ummah* i.e. the *ummah* of Muhammad (SAW).

(40) O Children of Israel! [15] Remember My favour which I bestowed upon you and fulfill My covenant, I shall fulfill your covenant. And fear Me and Me alone.

Israel, the title of *Ya'qoob* (Jacob) (AS), is a Hebrew word, meaning the bondsman of Allah. This is a call to the *Children of Israel* to embrace Islam and believe in the unlettered Prophet (SAW). In *surah Al-A'raf*, in response to the prayer of Moses (AS) to bestow mercy on the *Children of Israel,* Allah (SWT) says, *"Special mercy is assigned to those who follow the unlettered Prophet* (SAW) *- whom they shall find described in the Torah and the Injeel."* Allah (SWT) asks them to fulfill this covenant, so that He (SWT) fulfills His part of the covenant.

(41) And believe in what I have sent down, confirming that which is with you and do not become the first disbelievers thereof. And do not acquire a paltry price for my Ayaat. And fear Me and Me alone.

The *Qur'an* confirms that the *Torah,* revealed to Moses (AS), contained Divine guidance, and thus Allah (SWT) says to the *Progeny of Israel* that instead of being the first ones to deny the *Qur'an*, they should be the first ones to believe in it. *"And do not acquire a paltry price for my Ayaat* i.e. do not sell your faith merely for this world and its wealth which is bound to perish.

(42) And do not intermingle the truth with the falsehood and do not conceal the truth, while you know.

The Jews had been foretold in their scriptures about the Messenger hood of Muhammad (SAW). Therefore, they knew that he was the last Messenger, but they had distorted their scriptures and thus hidden the truth and intermixed it with falsehood. Allah (SWT) asks them not to do so after having known the truth.

(43) And establish Salah and give Zakah and bow down (before Allah (SWT)) along with those who bow down.

Salah has been an integral part of all Divine *Shar'iahs*, although the details have been different in different *Shari'ahs*. The Prophets of the *Progeny of Israel* laid stress on performing the *Salah*, but they became very negligent of their obligations. Allah (SWT) orders them to offer *Salah*, give *Zakah* (obligatory spending) *"and bow down (before Allah (SWT)) alongwith those who bow down"* i.e. join the Muslims of *Madinah*, whom they saw bowing down and prostrating before their Lord, and pray in congregation with them.

(44) Do you instruct people to practice righteousness and forget yourselves while you read the Book? Have you then no sense?

The Jews and the hypocrites used to command people to pray and fast but they themselves would not practice them and not act on what they called others towards. So Allah (SWT) reminds them of their behavior and affirms that the one who enjoins righteousness to others should be the first to obey and act on that command. *"While you read the Book. Have you then no sense?"* This means that the Jews used to command others to fulfill their covenant and pray and give *Zakah,* about which they read in their scriptures, but they themselves would not believe in Prophet Muhammad (SAW) and the *Qur'an* revealed to him. They had no sense of truth at all and became blind from the lies and falsehood they spread.

(45) And seek help with patience and prayers (Salah) and it is indeed very cumbersome except for the reverent.

Salah is onerous for all except the true believers, who submit themselves to their Lord.

(46) "Those who believe that they are to meet their Lord and that they are to return to Him." Indeed being patient and regular in prayers is hard, but not for the reverent people, who have the conviction that they have to face their Lord and account for their deeds. For such people, it becomes easy to perform the acts of obedience and refrain from the prohibitions.

The preceding *ruku'* was a call to the *Bani Israel (Progeny of Israel)* to embrace Islam and accept Prophet Muhammad (SAW) as the Messenger of Allah (SWT), and thus fulfill the covenant they had made with Him (*Surah Al-A'raf:* 157*)*. From here on, through the several sections that follow, a brief mention of the major incidents that happened in Jewish history has been made. Allah (SWT) reminds the *Children of Israel* of the favors He bestowed upon them and their forefathers, and how He preferred them above all nations, sent Messengers to them from among themselves, and revealed His books to them. He also reminds them of their evil deeds and falsehoods. Several incidents concerning the Jews have been discussed here briefly. The details of these incidents are present in the *Makkan* part of the *Qur'an.*

(47) O Progeny of Israel! Remember My favor that I bestowed upon you and that I exalted you over all the nations.

At one time in history, Allah (SWT) chose the Jews above all other nations, as His representatives on earth. They possessed the truth from Allah (SWT) and were given Books revealed to the Messengers among them.

(48) And be mindful of the day when no soul will avail another in the least, no intercession will be accepted from it, and no ransom will be taken from it, and nor will they be helped.

As we shall read in the following sections, the Jews believed that they would be saved from the Hellfire, as they were the chosen ones. This is the major reason for the corruption in their beliefs and their not remaining mindful of the Hereafter. Allah (SWT) refutes this claim of theirs by spelling out that on the Day of Judgment, their lineage or intercession of their leaders will not help them and no ransom will be accepted of them. On that day, every soul will face its own accountability, no soul will bear another's burden, and no one will be able to save even one's nearest ones.

(49) And when We delivered you from the people of Pharaoh who were afflicting you with severe torment--slaying your sons and leaving your women alive, and in that there was a tremendous trial from you Lord.

From here starts a long charge sheet against the *Progeny of Israel*. In this *ayah*, Allah (SWT) reminds them of the great favor He did to them by saving them from the immense persecution and torture of the people of *Pharaoh*, which was indeed a great test for them.

(50) And when We parted the sea for you; then We saved you and drowned Pharaoh's people, while you saw.

When *Musa* (AS) (Moses) and the *Progeny of Israel* escaped *Pharaoh*, he went out in their pursuit, alongwith his legion, but Allah (SWT) helped them escape by parting the sea and letting them cross it. On the other hand, Allah (SWT) drowned Pharaoh and his followers in the sea within the very sights of the *Progeny of Israel*.

(51) And when We appointed for Musa, forty nights; then you took to (the worship of) the calf after him, while you were unjust.

Allah (SWT) had called *Musa* (AS) to *Mount Sinai* for forty nights. The *Bani Israel* started worshipping a calf in his absence, and thus committed *Shirk*.[16]

(52) Then We forgave you, even after that, so that you might be grateful.

(53) And when We gave Musa, the Book and the criterion (of right and wrong), so that you may get guided.

On *Mount Sinai*, Allah (SWT) gave *Musa* (AS), the Torah, which was a criterion i.e. the understanding and guidance provided by religion to distinguish the truth from falsehood.

(54) And when Musa said to his people: "O my people! You have indeed wronged yourselves by your taking (to the worship of) the calf, so turn in repentance to your Creator and kill yourselves. That is better for you in

the sight of your Creator". Then He accepted your repentance; verily He is the one who accepts repentance, and the Most Merciful.

Allah (SWT) ordered that those who had taken to the worship of the calf be killed by those who had not worshipped it. Islam has retained this punishment for *Irtidaad* (renouncing the *Deen* of Islam). The Old Testament states that seventy thousand out of the six hundred thousand who had left Egypt with *Musa* (AS) had taken to the worship of the calf, and *Musa* (AS) ordered those who had stayed away from that heinous crime to kill all those seventy thousand people, with every tribe killing its own men, whether they be their parents, brothers, or relatives, and this is what *'kill yourselves'* means. *Musa* (AS) told them: *"That is better for you in the sight of your Creator"*, even though it may seem very cruel. Then Allah (SWT), being the Most Merciful of all, forgave all of them i.e. those who were killed as well as those who remained alive.[17]

(55) And when you said: "O Musa! We shall not at all believe you, unless we see Allah openly. So the thunderbolt struck you while you were looking on.

The seventy men whom *Musa* (AS) had taken with him to *Mount Sinai*, demanded to see Allah (SWT) with open eyes, before believing that the Torah had been given to *Musa* (AS) by Him. Upon this, Allah's wrath fell upon them and a thunderbolt struck them within their very sights, and they all died.

(56) Then We resurrected you after your death, so that you might be grateful.

Allah (SWT) resuscitated them, and when *Musa* (AS) prayed to Allah (SWT), He forgave them.

(57) And We provided you the shade of clouds and sent down upon you Mann and Salwa, (and said): "Eat of the good things out of what We have provided you". And they did not wrong Us but were wronging their own souls.

After recounting the calamities that Allah (SWT) saved the *Children of Israel* from, He mentions the favors that He bestowed upon them. The Israelites, six hundred thousand in number, left Egypt and came to the *Sinai* desert. They had a very long journey in the desert, without any shade to save them from the scorching heat and without anything to eat or drink.

Allah (SWT) bestowed His mercy on them and provided them with the shade of clouds, so as to save them from the heat in the desert. The *Mann,* something like a seed which was whiter than milk and sweeter than honey, used to rain down on the *Children of Israel* like snow flakes when dew fell. The *Mann* was sufficient in itself to fulfill their nutritional needs. As for the *Salwa,* it was a bird that looked like a quail.[18] The birds used to come in thousands and the

Israelites would catch as many as they wanted for a day. But despite these favors, they violated Allah's commandments.

(58) And when We said: "Enter this town and eat therein bountifully, from wherever you wish, and enter the gate bowing down in humility and say, 'Hittah' (forgive us); We shall forgive your mistakes and We shall increase (the reward) for those who are good in deeds".

Most of the scholars hold the view that the city mentioned in this *ayah* is Jericho *(Ariha)*. After the period of wandering extended over forty years, Allah (SWT) allowed them to conquer the Holy Land of *Jerusalem* and Jericho was the first town captured by them. Upon conquering the Holy Land, instead of following Allah's command by entering with humility and asking for His forgiveness, they entered while their heads were raised with defiance and arrogance and distorted the words. Here it is worth mentioning that when Muhammad (SAW) entered *Makkah* after victory, his forehead was touching the hair of the neck of his horse with humility.

(59) But those who were unjust substituted it with a word other than the one told to them. So We sent down upon those who were unjust, a scourge from the heaven, because of their transgression.

They distorted the word *Hittah* and said *Hintah,* meaning grain, seed or barley, thus mocking at Allah's command and displaying the worst kind of rebellion and disobedience, upon which Allah (SWT) unleashed His punishment upon them by inflicting them with plague.

Endnotes

[12] Surah Sad (38): 75.

[13] Surah Al-Kahf (18): 50.

[14] Surah Al-A'raaf (7): 23.

[15] Israel is a word of Hebrew language which means 'Abdullah ,"*the slave of Allah (SWT)*", and it is the title given to *Ya'qub* (AS) by Allah (SWT) and his progeny is called *the Children of Israel*.

[16] This happened at Mount Sinai, where *Musa* (AS) was summoned by Allah after their exodus from Egypt, and was given the Ten Commandments.

[17] At-Tabari, 2:73

[18] At-Tabari 2:96

***